قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمن آرائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

فون۔ ۷۲۳۹۲۰

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۶ اپریل ۱۹۹۳ء شمارہ ۴

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ :-/۱۰ روپے

خط وکتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۴
مسلمان کی زندگی	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۷
منڈی کا دین	عاطف طفیل	۲۳
نظامِ ربوبیتِ عامہ	اسلم رانا	۲۸
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن	عبداللہ خالد خاں	۴۳
حقائق و عبر	ادارہ	۴۷
نقد و نظر	ادارہ	۵۴
نفسِ واحدہ	سید عبدالودود	۵۶
ملتِ پاکستان کے لئے لمحۂ فکریہ	راجہ عبدالرزاق	۶۲
اکیسویں صدی کے تقاضے اور قرآن	حنیف وجدانی	۶۶
بچوں کے لئے	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۷۲
اشاریہ ۱۹۹۲ء	ادارہ	۷۴
اعلاناتِ درس	ادارہ	۷۷
قارئین کے نام	ایڈیٹر	۸۰

دعوت نامہ

طلوعِ اسلام کنونشن میں شمولیت کے لئے اکثر احباب کو رسمی دعوت نامے کا انتظار رہتا ہے جو بسا اوقات ان تک وقت پر نہیں پہنچ پاتا۔ امسال پرچہ چونکہ کنونشن سے قبل شائع ہو رہا ہے۔ لہذا پرچے میں موجود اسی دعوت نامے کو ادارہ کی طرف سے رسمی دعوت نامہ سمجھتے ہوئے خود بھی تشریف لائیں۔ اہل و عیال اور دوستوں کو بھی ہمراہ لائیں۔ ادارہ اس عزت افزائی کے لئے آپ کا ممنون ہوگا۔

ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام

سالانہ کنونشن ۱۹۹۳ء

امسال طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن اپنے روایتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی کے ساتھ

ادارہ طلوعِ اسلام، واقعہ بی/۲۵، گلبرگ ۲ لاہور میں

پروگرام

جمعرات ۸ اپریل ۱۹۹۳ء

۹½ بجے صبح تعارفی اجلاس۔ صرف مندوبین کے لئے۔

۳ بجے کھلا اجلاس خطابات بعنوان

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں (غالب)

جمعۃ المبارک ۹ اپریل ۱۹۹۳ء

۹½ بجے صبح بزمِ مذاکرہ۔ خطابات کالج طلباء بعنوان

ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا!

یہ انعامی مقابلہ ہوگا جس میں کالج اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات حصہ لے سکیں گے

- جیساکہ آپ کو معلوم ہے طلوعِ اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں جیسی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی فکری محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آدابِ مجلس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔
- باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے بشرطِ اطلاع، رہائش کا بندوبست کر دیا جائیگا۔ ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یوں تو اس وقت ساری دنیا ہی میں کہیں امن و سکون، عدل و انصاف کی برتری نظر نہیں آتی لیکن اپنے ملک کے حالات پر نظر دوڑائیں، تو قیامِ پاکستان کے اب تک کے ۴۵، ۴۶ سالوں میں اس افتراق و انتشار کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ یہ اسکی سخت جانی تھی کہ آبادی کی اکثریت رکھنے والے بازو سے محروم ہونے کے باوجود یہ ملک سنبھل گیا، اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو گیا، اقوامِ عالم میں اپنے آپ کو منوانے کے قابل ہو گیا مگر دیکھتے دیکھتے تفرقے اور انتشار کی آکاس بیل نے پھیلنا شروع کر دیا اور اس کے بڑھنے پھولنے کے سوتے خشک کرنے شروع کر دیئے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مسلمانانِ ہند نے اعلان کیا کہ وہ بحیثیت مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور بطور ایک قوم ایک وطن ان کا حق ہے، انہوں نے نہ جھکنے والے، نہ خریدے جا سکنے والے ایک قابل، مخلص رہنما کی عظیم قیادت میں اپنی بات منوائی اور بطور ایک قوم کے الگ وطن حاصل کر لیا۔

مگر تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان ایک سادہ اور صاف دل گروہ ہے، مخالفین نے ہمیشہ انہیں اپنی پُر پیچ چالوں سے شکار کیا ہے۔

مقامی مفادات کے حامی لوگوں کا سہارا لے کر اسلام کے آفاقی پیغام کو دھندلانے اور اس طرح سے امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے۔

پہلے بنگالی قومیت کو ابھارا گیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کو دور کرنے کے لئے بنگالی عصبیت کا سہارا لیا گیا۔ ان کی معاشی پسماندگی کو مغربی پاکستان کے استحصال کا نتیجہ بتایا اور سمجھایا گیا، اس کے مقابلے کے لئے کسی نے ان کی معاشی حالت کو بدلنے کے اقدام کرنے کی بجائے خالی خولی نعروں کا سہارا لیا گیا مگر بھوکے کا پیٹ نعروں سے نہیں بھرا جا سکتا۔ وہ اُدھر سمجھتے رہے کہ جیسے ان کا سارا مال کھینچ کے مغربی پاکستان میں لایا جا رہا ہے اور یہاں شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ خوشحالی کا دور دورہ ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ حکومتوں کے پاس بے حساب ذرائع ابلاغ ہوتے ہیں، اگر انہیں درست

طریقے سے بروئے کار لایا جاتے، تو عوام تک بات پہنچانا کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ہوتا، اگر آسانی سے نہیں تو بمشکل اور سب کو نہیں تو بہت بڑی تعداد کو سمجھایا جا سکتا تھا کہ چند بڑے شہروں کا نام مغربی پاکستان نہیں، یہاں بھی پنجاب کے دیہاتوں، سندھ کے گوٹھوں اور سرحد اور بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑیوں میں بسنے والے عوام بھی ویسی ہی محرومی اور پسماندگی کا شکار ہیں جس کا بنگالی عوام کو شکوہ ہے ـــــ اور اس کا حل اسلام کے منشور پر عمل کر کے غربت اور جہالت کو دُور کرنا ہے نہ کہ اپنی جمعیت کو پارہ پارہ کر کے خود کو کمزور اور پسماندہ تر کرنے میں ـــــ

اسی وقت مغربی پاکستان میں بھی ان قوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا جو علاقائی حقوق کے علمبردار تھے، ـــــ انگریز کے بنائے ہوئے صوبوں کی لکیروں میں گھرے ہوئے لوگوں کو علاقے کے مفاد کے نام پہ دوسروں سے دور کرنا بلکہ ان کے مقابل کھڑے کرنا کسی صورت بھی پاکستان کی خدمت قرار نہیں دی جا سکتی۔ سرحد میں پختونستان کے حامی، بلوچستان میں عظیم تر بلوچستان کے علمبردار، سندھ میں سندھو دیش کا راگ الاپنے والے ـــــ کہیں بھی ان علاقوں کے عوام نہیں بلکہ ان علاقوں کے مفاد پرست بڑے لوگ ہیں جو عوام کی خوشحالی کے دشمن اور انہیں اپنے محتاج اور غلام رکھنا چاہتے ہیں ـــــ اور ایک مسلمان قوم کے نام پر وجود میں آنے والا ملک، بنگالی، پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی قوموں پر مشتمل ملک بن گیا ـــــ

بنگالی الگ ہو گئے، سرحد کا پختونستانی نعرہ شرر سے شعلہ نہ بن سکا، سندھو دیش کا راگ ہمسایہ ملک کی شہ پر اونچے سروں میں الاپا جانے لگا، تو سندھ میں ہندوستان سے آ کر بسنے والے لوگوں نے خود کو اپنے ماحول میں اجنبی محسوس کر کے اپنی شناخت کے لئے مہاجر قومیت کا نعرہ بلند کر دیا، جن کو یہ فائدہ مند لگا انہوں نے اُسے قبولیت کی سند دی اور یہ نیا بچا کھچا پاکستان چار کی بجائے پانچ قومیتوں کا وطن کہلانے لگا اور سارے ملک کے، سارے صوبوں کے عوام کا سانجھا، یعنی پاکستان شہر کراچی امن و بھائی چارے کا مظہر ہونے کی بجائے باہمی مخاصمتوں اور عداوتوں کا اور اس کے نتیجے میں قہرِ الٰہی کی صورت اختیار کرنے والے خون خرابے کا گڑھ بن گیا۔

ہر کسی نے علاقائی مفادات کا نعرہ بلند کیا، وہ جو حالی نے کہا کہ

اس دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کو بھی تُو نے آخر نیچا دکھا کے چھوڑا

کبھی پنجاب نے پنجابیت کا نعرہ نہیں لگایا گیا، بنگال میں پنجابی گالی کا مترادف شمار ہونے لگا، سندھو دیش والوں نے اسے اچھوت قرار دے ڈالا، بلوچستان میں بھی وہ قابلِ قبول نہ رہے، اور تو اور ہندوستان سے آئے لاکھوں کا مسکن ہونے کے باوجود مہاجروں نے بھی اسے غیر اور قابلِ نفرت سمجھا، سرحد سے آ کر بسے پٹھانوں نے اس سے فائدہ تو اٹھایا مگر کبھی اپنایا نہیں مگر انہوں نے کبھی اپنی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا، کبھی انہیں غیر نہیں کہا کہ یہ ظفر علی اور اقبال کے

خوابوں کی زمین تھی ـــــ مگر آخر آخر پنجاب والوں کو بھی غیرت دلائی گئی، انہیں اکسایا گیا اور یہاں بھی جاگ پنجابی جاگ کا نعرہ بلند ہونا شروع ہو گیا۔

صوبائی عصبیت میں بٹی ہوئی زبانوں کے نام پہ الگ الگ ہوئی جمعیت کو جبہ و دستار والوں نے فرقوں میں بانٹ کر رہی سہی کسر پوری کر دی، فرقے کب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ تھے اور وہ بھی خدا اور رسولؐ کے نام پہ ـــــ مگر اس بانٹ کو دن بدن شدید سے شدید تر کیا جاتا رہا ـــــ اس کے علاوہ اور عصبیتیں بھی ہیں ـــــ دیانتداری سے بتایئے قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور میں کبھی آپ نے یہ صوبائی عصبیت دیکھی تھی، لسانی عصبیت سنی تھی، نسلی عصبیت کو درخورِ اعتنا سمجھا تھا، آج پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچی، مہاجر، شیعہ، سنی، اہلِ حدیث، دیوبندی، بریلوی ـــــ اور پھر برادریاں، شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شخص ایسا ہوگا جو اپنے نام کو ـــــ خان، بھٹی، بٹ، ڈار، میاں، چیمہ، چٹھہ، چدھڑ، گوجر اور خدا جانے کون کونسی گوت کے بغیر مکمل سمجھتا ہو، یہ نسبتیں اب وجہِ افتخار بن چکی ہیں۔

اور مسلمان قومیت کا وجود ہوا میں تحلیل ہو چکا ہے اور پھر بھی اہلِ سیاست نظریۂ پاکستان کا راگ الاپتے اور نظریہ کو اینٹ پتھر کی عمارت کی شکل دینے پر کمربستہ ہیں، سمجھتے ہوئے کہ جو بات دلوں میں راسخ نہ ہو، ذہنوں میں جاگزیں نہ ہو، وہ اینٹ و پتھر میں متشکل ہو کر محض بے جان عمارت ہوتی ہے اور وقت کی گردشیں آخر ایسی عمارتوں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

انتشار ایک طرف اضطراب کو اور دوسری طرف مایوسی کو جنم دیتا ہے، ہم اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔

آپ پوچھیں گے اس کا حل کیا ہے؟

ہمارا کہنا ہے آپ نے کبھی اس کی وجوہ پہ بھی غور کیا ہے، وجہ سمجھ آ جائے، تو حل بھی ہو سکتا ہے، مرض کی تشخیص ہو جائے تو علاج بھی ممکن ہو جاتا ہے ـــــ

آخر ایک مسلمان قوم کیسے اتنی جلدی اس انتشار اور افتراق کا شکار ہو گئی، کیا اس کی وجہ سیاست ہے، مذہب ہے، غربت ہے، جہالت ہے، طبقاتی تفریق اور اقتصادی اونچ نیچ ہے ـــــ

ہم اسے سمجھنے یا سمجھانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔

باقی آئندہ

(اہلِ فکر و نظر اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہیں، تو طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں۔ مدیر)

علامہ غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمان کی زندگی

جب انسان پر مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ ظلمت کدۂ عالم میں امید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی تمام اسباب وعلل ایک ایک کر کے جواب دے دیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔ عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش خاک کے ذرّوں سے ابھرتے چلے آتے ہیں۔ وہ انکی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے۔ زندگی اُسے مسلسل مصائب وتکلیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے۔ انسان اسے ایک بےکس و بےبس مجبور و مظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور وستم اور ظلم واستبداد کی المناک صعوبتیں جھیلنے کے لئے اس وحشت ناک کرہ میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اسے دیکھے۔ اس لئے جب وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں بھی مسرت وشادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی۔ ہر چہرہ تبسم ناآشنا اور ہر پیشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے ہر بار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ:-

"زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے۔ خالص اور دوامی مصائب۔ ہر آرزو ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ لہٰذا سکون و اطمینان عدم آرزو ہی میں ہے۔" (مہاتما بدھ)

وہ حیاتِ انسانی کو ایک لغو باطل شئے قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ زندگی محض سراب ہے۔ دھوکا ہے مایا کا جال ہے (اپنشد) وہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق خیال کرتا ہے (شوپنہار) وہ اس مصیبت کدہ سے دُور بھاگنا چاہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناکامیوں کے پردوں میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں اس لئے اسے عام انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور چونکہ عام انسانوں میں سے صاحبانِ ثروت واقتدار کو وہ اپنی لُٹی ہوئی مسرت کا غاصب سمجھتا ہے اس لئے ان انسانوں کے خلاف نہیں، بلکہ خود دولت وثروت، شوکت وسطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے۔ وہ انسانوں کی بستیوں کو چھوڑ کر دُور جنگلوں میں جا کر

بسیرا کر لینا ہے۔ اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و عزت کے خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے قلبِ مجروح کو تسلی دے لیتا ہے کہ خیر، اس دنیا میں تو یہ جو جی چاہیں کر لیں "آسمانی بادشاہت" میں تو ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ ستم رسیدہ، کمزور

ترکِ دنیا

ناتواں، ضعیف، مغلوب و مقہور انسان کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نہیں۔ اس کے طالب خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں۔ البتہ اس کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں وہ لوگ جو یہاں دولت و حشمت کے مالک ہیں ذلیل و خوار ہونگے اور جو آج ذلیل و خوار ہیں وہ معزز و مکرم۔ آسمانی بادشاہت انہی مفلس و غریب انسانوں کی وراثت ہے۔ نروانا میں جم کے مقرب یہی لوگ ہونگے۔ دیولوک میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے یہی بھگت ہیں۔ یہی تعلیم کنیسہ و صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے۔ یہی فلسفہ تارک الدنیا سنیاسی اور تیاگی بھگشو کا سچا دھرم ہے۔ اس فلسفہ و مشرب کی لم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کر کے مستقبل کو مزین بنایا جائے۔ دنیا کی رسوائیاں، عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں۔ یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزت ہو۔ یہاں جتنا پست ہو۔ وہاں اتنا ہی بلند ہو۔ یہاں کا محتاج وہاں کا غنی، یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوشحال اور یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو۔ وہ یہاں کے مصائب و آلام کو بُلا بُلا کر اپنا گھر دکھائے کیونکہ اسے ان میں ابدی مسرتوں کے پیام نظر آ رہے ہیں۔ غرضیکہ وہ دنیا و آخرت کے مابین ایک ایسے ناقابلِ شکست آئینہ کی سدِ سکندری قائم کر دے جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم، خالقِ کائنات کی دی ہوئی تعلیم قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجبور و مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانہ میں عمر بھر قید رہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقعہ یہ منشاء ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فناہ کر دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابلِ نفرت و ملامت ہیں؟ کیسا یہاں کی ہر سہانی شئے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے؟ کیا مقصدِ حیاتِ انسانی ذلت و رسوائی، محتاجی و

کیا دنیاوی زندگی ذلیل ہے؟

ناداری، نکبت و مسکنت، افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے؟ کیا پھر ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم۔ یہاں کی رسوائیوں اور ذلتوں کے معاوضہ میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہوگی جو دنیا کی ہر قوت سے ڈرتی دبکتی دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہوگا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس تک بٹھانا پسند نہ کرے؟ کیا دولت و حشمت، عزت و وقار کی زندگی

واقعی جنّت سے محرومی کا سبب ہوگی ؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا باب السّلام قطعاً مسدود ہوگا؟ کیا یہاں کے چاندی اور سونے کا ہر ٹکڑا جہنّم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا؟ فقر و مسکنت کیا واقعی خدا کی نعمت ہے ؟ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے ؟

ان سوالات کا جواب آپ اپنے دماغ سے، کہ جس پر ایک عرصۂ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، کچھ ہی دیجئے اور اس سے مطمئن ہو جائیے۔ لیکن آئیے ہم دیکھیں گے کہ قرآن کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے کہ وہی تعلیم، تعلیم خالقِ فطرت اور وہی حُکم، حکمِ خداوندی ہوگا۔

قرآن کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پوزیشن اس کائنات میں ایک مخدوم کی ہے اور جُملہ موجوداتِ عالم اس کی خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ (۴۵/۱۳)

پستیوں اور بلندیوں (ارض و سمٰوٰت) میں جو کچھ ہے سب کو تمہارے لئے مسخّر کر دیا گیا ہے

انسان کی پوزیشن

لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شئے کو اپنا تابع فرمان بنائے۔ فطرت کی ہر چیز سے کام لے کیونکہ یہ سب ایک معینہ مدّت تک اس کی متاع ہیں۔ دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدا تعالےٰ نے حرام نہیں کیں (۳۳ : ۷) بلکہ ان میں انسان کے لئے ایک خاص کشش و محبّت رکھی ہے (۱۴ : ۳)۔ ان سے فائدہ اٹھانا، ان کو کام میں لانا ہی انکی تخلیق کا مقصد ہے اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزّت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کے غلط استعمال سے ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی ناہموار ہو جاتی ہے جس سے ہماری اجتماعی زندگی میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے۔ اگر دولت و قوّت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلّت و پستی کی زندگی بھی انسانی تخلیق کی غرض و غایت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم ہمیشہ اس افراط و تفریط کو مٹانے کیلئے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا اس باب میں اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لَے رہی ہے۔ یعنی وہ ان عیوب اور نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت اور قوّت کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو ابھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور انہیں ایسی تعلیم دیتے رہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو مترفین میں پیدا ہو جاتے ہیں

دولت و ثروت کے غلط استعمال سے نظامِ انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضرات انبیاء کرامؑ جن کمزوروں کو ابھار کر بلند سطح پر لاتے تھے۔ انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا تم حدود اللہ کی نگہداشت کرنا ورنہ انکے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے۔ وہ قوانینِ الٰہی سے مُنہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کر دیتے تھے جس سے ان کے اور خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس طرح انسانیت کا نظام متوازن و ہموار طریق پر چلتا رہے۔ بس یہ ہے خلاصہ آسمانی تعلیم کا جو انسانوں کی ہدایت کیلئے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اسی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سرخروئی ہے۔ میزان خداوندی

دنیا اور آخرت

کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے یہ دو پہیئے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں۔ آزادیوں کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے اُبھر نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدوسیوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ یاد رکھئے! اگر نعمائے آخرت خدا کا انعام ہیں تو دنیاوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں۔ اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی۔ لہٰذا

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۷/۶۹)

اللہ کی یہ نعمتیں یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو

حضرت صالحؑ نے قوم ثمود سے کہا :-

"تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اس نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں متمکن کیا۔ تم نرم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (محفوظ) عمارات تعمیر کرتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو پیشِ نظر رکھو اور زمین میں فسادات مت پیدا کرو (۷ : ۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین میں قلیل تھے۔ اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی (۷ : ۸۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۶ : ۱۲۲) اور آلِ ابراہیمؑ کتاب و حکمت کے ساتھ ملکِ عظیم کی بھی مالک بنائی گئی (۴ : ۵۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ حضرت یوسفؑ کو اس قدر گردش کے بعد جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا۔ وہ یہی تمکن

اس حسنۂ کبریٰ کو ان کے صبر و تقویٰ کا اجرِ جزیل کہا گیا۔

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں صاحبِ حکومت بنا دیا (متمکن فی الارض کر دیا) کہ وہ جہاں چاہیں رہیں۔ ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچا دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (۵۶ :۱۲)

حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت و حشمت، تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس شدت و تکرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں کوئی اور واقعہ اس شد و مد سے دہرایا نہیں گیا۔ اس تمکن کو کمزوروں پر خاص احسان کہا گیا ہے

"ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کر دیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو دیگر اقوام کا امام بنا دیں اور ملک کا وارث قرار دے دیں اور انکی حکومت کو زمین پر قائم کر دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے (۲۸/ ۵-۶)

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ۝ (۱۳۷ : ۷)

"اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی اس بابرکت زمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا اور آپ کے رب کا وعدۂ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں انکے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور فلک بوس عمارات کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔"

صبر و توکل، سعی و عمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لئے حضرت موسیٰؑ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کر رکھا تھا۔

"موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تعالیٰ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے جسے چاہے (اپنے قانون کے مطابق) اپنے بندوں میں سے ان کا مالک بنا دے اور آخری انجام تو متقین کے لئے ہی ہے۔ (۱۲۸ :۷)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی۔

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا اور تمہیں تمام اقوامِ عالم پر برتری عطا کی تھی۔ (البقرہ و دیگر مقامات)

اور جب اس قوم نے قوانینِ الٰہی سے سرتابی اختیار کی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اسی نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ (۲:۶۱)

اور ان پر ذلّت اور مسکینی کی مار ماری گئی اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

تاریخی یادداشتیں

مذکورہ صدر قصص، قرآن کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں۔ بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اُمم گزشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے۔ اور بار بار تاکید کرتا ہے کہ غور و فکر سے دیکھو کَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ جن قوموں نے قوانینِ الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہُوا۔ ظاہر ہے ان مقامات میں اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف توجہ دلانا ہی مقصود ہے کیونکہ اخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا۔ ان میں سے بعض قومیں قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرفِ مکرّر کی طرح مٹ گئیں اور انکی محض داستانیں تاریخ میں باقی رہ گئیں۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ (۴۴ : ۲۳) اور بعض قومیں گو زندہ رہیں (اور اب بھی زندہ ہیں) مگر انکی حالت عبرت و موعظت کی زندہ داستان ہے۔ پھر قرآن کریم نے ان تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ واضح الفاظ میں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا۔ کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ہے۔ اور یہاں کی ذلت و خواری اس کا عذاب اور غضب ہے مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان لاتے اور عملِ صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا حاکم بنائے گا (۲۴:۵۵) کہیں یہ تشریح ہے کہ جو کوئی عمل صالح کرے گا وہ مرد ہو یا عورت شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اس کو خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں انکا اجر دیں گے (۱۶ : ۹۷) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے (۱۶ : ۴۱) جو اس کے دیئے ہوئے

قرآن کی تعلیم

کی قدر کرتا ہے۔ اپنی قوتوں اور اس کی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے کہ یہی عملاً شکر گزار ہے، اللہ اپنی ان نعمتوں میں اور اضافہ کرتا جاتا ہے (۱۴ : ۷) برعکس اس کے جو قوانینِ خداوندی سے بلا علم و ہدایت، بلا دلیل و برہان جھگڑتا ہے۔ ان قوانین سے مُنہ موڑ لیتا ہے۔ وہ خود بھی منزلِ مقصود تک لیجانے والے راستہ سے بہک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اسے دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور اس کے بعد کی زندگی میں عذابِ حریق ملے گا (۲۲ : ۸) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے مانے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اسے اختیار کرلے اور جس میں کسی

قربانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ اس کی طبع سہولت پسند پر گراں گزرے، اس سے پہلوتہی کرے، اس کے لئے بھی خزی فی الحیوۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب تیار کیا گیا ہے (۸۵ : ۲) ایک دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں۔

اس تصور کو دلوں میں اچھی طرح جاگزیں کر دینے کے بعد مسلمانوں کے لئے ایک دستور العمل، ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا۔ جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے جو اقوام گزشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود تھا ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیتے

اور اسی ایمان و تقویٰ سے مسلمانوں کو دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائے گا اور تمہاری لغزشوں کو دور کر دے گا اور تمہاری کوتاہیوں سے درگذر کریگا اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے (۲۹) "

مومنین کی زندگی

اس لائحہ عمل کی رو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا۔ ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد، غیر منقطع سعی و عمل۔ انتھک کوشش، کوہ شکن عزم، غیر متزلزل استقامت، پیہم جہاد اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی۔ جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسن عمل، اپنے اعمالِ صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا۔ ذلت و پستی کی زندگی، محتاجی و فلاکت کی زندگی، مجبوری و بے بسی کی زندگی کہ جسے قرآن نے غضبِ خداوندی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ نصیب اعدا کر کے خود عزت و وقار کی زندگی، خوشحالی و خوش بختی کی زندگی عظمت و شوکت کی زندگی، حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھی، کہ یہی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و عمل صالح کرنے والی جماعت کی حیاتِ طیبہ ہو سکتی تھی، ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل، اپنے اللہ سے دین و دنیا کے جیتے لینا تھا۔ (۴۷ : ۳) وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم میں سے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ (۳۲ : ۲۵) جسے نوعِ انسانی میں سے بہترین امت قرار دیا تھا۔ (۳ : ۱۱۰) ایسے عبادِ صالح بننا تھا جن کے لئے وراثتِ ارضی مقدر ہو چکی تھی۔ (۱۰۵ : ۲۱) اور عملاً یہ تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کیلئے ایک عظیم الشان پیغامِ موعظت ہے۔

بلاغِ مبین ہے (۱۰۶ : ۲۱) اور ساری دنیا کو دکھا دینا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۴ : ۱۰)

ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی۔ یہ قانونِ الٰہی غیر متبدل ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے

نہیں بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں (۵۱ : ۴۰) یوں پورا ہوا کرتا ہے۔ سکانِ ارضی کو عملاً بتا دینا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے (۴۵ : ۲) کس طرح دشمنوں کے جمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و ظفر رکاب چومتی ہے (۴۵ : ۸) الغرض انہیں اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر کے یہ دکھا دینا تھا کہ یاد رکھو تمام خوبیاں، ہر قسم کی کامیابیاں، صرف مومنین کیلئے ہیں۔ مجاہدین کیلئے ہیں۔ "اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۸۸ : ۹) اور "یہی لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں" انہوں نے یہ کچھ کر کے دکھا دیا اور ان کے رب نے وہ تمام وعدے پورے کر دیئے جو ان سے کئے گئے تھے۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۳۳ : ۲۷)

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور اس سرزمین کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے (۸ : ۴۳) جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں جس سے یہ انہیں زیادہ دکھائی دیں (۸ : ۴۴) کہیں ایسے لشکروں کو بھیج کر انکی مدد کی جاتی جنہیں کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعداء کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا (۸ : ۱۲) کبھی ان میں کا ایک، دو دو پر بھاری ہوتا (۸ : ۶۶) کبھی دس دس پر (۸ : ۶۵) ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ لپٹی ہوتی خدا کی (۸ : ۱۷ - ۸) انکے مقابلہ میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی نہ قوت۔ اس لئے کہ یہ قوانینِ خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے اور وہ ان راستوں کو بھول چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ اور ہر میدان ان کے قبضہ میں

ہوتا اور اس طرح بتا دیا جاتا کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ چنانچہ اس وعدہ کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تند تیز مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا۔ چند ہی سال کے عرصے میں ایک شجرِ طیب کی طرح یوں بڑھا، پھولا پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوجِ ثریا پر تھیں، اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

"محمدؐ اللہ کے رسول اور انکے ساتھی، کفار کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع میں ہیں کبھی سجدوں میں۔ اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ انکے اوصاف تورات میں ہیں اور انجیل میں ہیں۔ جیسے کھیتی کہ پہلے اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر وہ درست ہو کر اوپر کو ابھری، پھر وہ اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ (اسے دیکھ دیکھ کر) کسان کا دل خوشی سے اچھل پڑے اور اس سے حاسدین جل جائیں۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے مغفرت اور اجرِ عظیم کا (جو) وعدہ کر رکھا تھا۔ (وہ یوں پورا ہو کر رہا) (۲۹ : ۴۸)

چنانچہ اللہ کے یہ مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے تو وہ وقت انہیں یاد آتا جب وہ قلیل تھے۔ ملک میں کمزور و ناتواں شمار کئے جاتے تھے۔ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں اچک کر نہ لے جائیں۔ سو ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی اور انکو بڑی نفیس چیزیں عطا فرمائیں کہ وہ خدا کے فرمانبردار بندے بنیں" (۲۶ : ۸) اسی انقلابِ عظیم کا احساس تھا جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرتے کہ :-

"یہ وادیٔ ضجنان وہی ہے جس میں ایک اونی کرتا پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ وہ سخت مزاج آدمی تھے۔ کام لیتے تو تھکا دیتے تھے۔ کم کام کرتا تھا تو پیٹتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں"

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین، عبادات کا صحیح مفہوم۔ اعمالِ صالح کی سچی تفسیر، دنیا و آخرت کا حقیقی تعلق۔ قرآن کریم کا عملی نظام۔ اسوہ رسولؐ اللہ کی بیّن تصویر، ہر مسلمان کے سامنے تھی، بہت جلد ختم ہو گیا۔ خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کر کے اسلامی کلچر میں نمودار ہو گئیں اور اس کی انتہا عہدِ عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی

اس کے بعد؟

تھا اور روح یکسر عجمی ہو چکی تھی۔ حکومت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں۔ وہ مجاہدانہ زندگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل ایمان تھی، بیگار کے بھرتی شدہ مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ گرمجوشی کی وہ فاروقی روح جو خالد ابنِ ولیدؓ کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اٹھتی تھی (حالانکہ وہ میدانِ جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے انہوں نے ایسا کیا تھا) اب عہدِ کہن کا افسانہ بن چکی تھی۔ برہمنیت، جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا امت میں نمودار ہو چکی تھی۔ علماء کا الگ طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو بجائے تیر و سنان کے لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا۔ اربابِ طریقت عجمی تصوف کے تباہ کن نظریہ کے ماتحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر رہے تھے۔ یہ سب سامانِ ہلاکت پہلے سے جمع تھے کہ شامتِ اعمال نے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی، اسلام کی مرکزی قوت فنا ہو گئی۔ اس کی اجتماعیت بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے۔ قوتیں سلب ہو چکی تھیں، حوصلے پست ہو چکے تھے دنیا ہاتھ سے نکل گئی۔ عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آگئی، شوکت و حشمت کی بجائے ذلت و مسکنت چھا گئی۔ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، مناسک و شعائر کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مرتب ہوتے تھے۔ قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں اور اس قسم کے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت نصیبہ یاوری کرتا، ہمارے اعمال کی سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی تو نگاہ اس طرف جاتی کہ یہ تمام عبادات، یہ تمام اعمال جن کی شکل اسلامی ضرور ہے، اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہ ہوں جو عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ میں ہوئے لیکن بدبختی کہ زاویۂ نگاہ الٹی طرف بدلا۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں کامیابی فلاح، سرخروئی۔ فوزِ عظیم۔ رزقِ کریم۔ حسنِ مآب مومنین کے لئے مخصوص کیا تھا۔ ان سب کو آخرت کی زندگی سے مخصوص کر دیا گیا۔ اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رکھا جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود عقیدہ کی شدت اور صوم و صلوٰۃ اور تسبیح و تہلیل کی پابندی کے دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

پھر کیا ہوا؟

زاویۂ نگاہ کی تبدیلی

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

اس وقت بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا کہ ان الفاظ و اعمال کی روح مفقود ہو چکی ہے اس لئے صحیح

نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیا کہ یہ تمام "اعمال" رائیگاں نہیں جارہے ان کا نتیجہ اُخروی زندگی میں برآمد ہوگا غیر مسلم خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان پر رشک آتا۔ انہیں اپنے لٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے، اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ ابتلا کی زندگی ہے جس میں انہیں مہلت دی گئی ہے۔ اُخروی زندگی میں ہم جنّتِ جاودانی اور وہ جہنّم ابدی میں جائیں گے۔ عیسائی راہبوں کا فلسفۂ ترک علائق، یونانی مشائین کی حکمتِ ترکِ دنیا، ہندو مت کا سنیاس۔ بدھ دھرم کا سنسار تیاگ، ایک ایک کرکے اسلامی کلچر میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا ترکِ دنیا۔ ترکِ علائق۔ ترکِ لذائذ حتّٰی کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خدوخال قرار پا گئے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابُ الست
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور — کہ معرکے تھے شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کش کشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں تھی تو اور کیا تھی شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ نظامِ انسانیت کو تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی حالت سے یہ کہہ کر محترز رہنے کی تاکید کی تھی کہ دیکھنا کہیں دولت و قوت ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ تمہاری منزلِ مقصود اس سے کہیں بلند ہے۔ اب جہاں جہاں قرآن کریم میں ایسی تعلیم تھی اسے دنیاوی متاع و اسباب سے نفرت دلانے کے لئے بطور نصِ صریح پیش کرنے لگے۔ یعنی طبیب نے بڑھتی ہوئی حرارت کو روکنے کے لئے سر پر برف رکھنے کی تاکید کی تھی، کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔ یہ اسی برف کا استعمال فالج کے مریض کرنے لگ گئے۔ دنیاوی زیب و زینت کو قرآن کریم نے بالتصریح حلال فرمایا تھا۔ وہ سب حرام قرار پا گئیں۔ چیتھڑے پہننا، بھوکے رہنا، خراب و خستہ ہونا۔ بے گھر بے در زندگی بسر کرنا "خدا کے بندوں" کی علامات متصور ہونے لگیں۔ غرضیکہ ایک ایک کرکے اس رہبانیت کی تمام باتیں جزوِ اسلام (بلکہ اصل اسلام) بن گئیں۔ جن کو روکنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ اور جس کو اس نے بدعت قرار دیا تھا (۲۷ : ۵۷)۔ اسلام رہبانیت

اجتماعی زندگی

کا اس لئے مخالف نہیں کہ اس سے لوگ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ وہ اس کے اس لئے خلاف ہے کہ اس سے ایک ایسی انفرادی نجات کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے جس کو اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ اس سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔ قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ افراد کا تزکیۂ نفس ضروری، اس لئے ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم مرتب ہوگی

وہ خود بخود متزکی ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان ایک عظیم الشان مشینری کا پُرزہ ہے جس کی ہر حرکت اور ہر جنبش ساری مشینری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہر ایک پُرزہ اپنی اپنی جگہ یاقوت و الماس کے ریزوں پر قائم ہو۔ خالص سونے اور چاندی کا بنا ہو، لیکن اس کی حرکت کا تعلق باقی پرزوں سے نہ ہو۔ تو اس مشینری کیلئے ایسے پُرزے کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس کا فی ذاتہٖ صالح (درست) ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اگر اسلام کا نصب العین ایسی انفرادی اصلاح ہی ہوتا تو رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کو غاروں میں چھپ کر نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے تو کوئی نہیں روکتا تھا؟ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ایک ذہنیت کے بدل جانے سے تمام تعلیم کی روح بدل گئی اور عبادات کا مفہوم اسی قسم کی انفرادی اصلاح سمجھ لیا گیا ہے جسے اجتماعیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ تمام عالمِ اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے مہلک جراثیم پھیل گئے اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی تمام شوکت و حشمت ذلّت و مسکنت میں بدلتی چلی گئی۔ حتّٰی کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم جس کے نزدیک خدا کی رحمت سے مایوس ہونا کفر کے مترادف تھا۔ یاس و حرمان کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے اور چونکہ وہی تعلیم جو اس واماندگی، ضعف و ناتوانی، پریشانی و پراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی، اصل اسلام بن چکی ہے۔ اس لئے عوام تو اس نشے میں مست ہیں کہ یہاں جس قدر ہوسکے تباہ حال ہو جائیں۔ جونہی آنکھیں بند ہوئیں، ہم جنّتِ جاودانی میں جا بیٹھے اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب اسلام کا نتیجہ ہے اسلام سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ "دین کے علمبرداروں" کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں اور بے دینوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین دار اُن کی دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں۔ "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں "وہ صاحب اوصافِ حجازی نہ رہے"۔ لہٰذا ان دونوں میں ایک ایسی حدِّ فاصل، ایک گہری خلیج حائل ہو چکی ہے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں کو، دین اور دنیا کو، ناقابلِ اتصال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں۔ "حامیانِ دین" نے اسی وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزّت باقی ہے۔ مسلمان غرباء کے طبقہ کی حالت آج خون کے آنسو رلا دینے والی ہو چکی ہے

غریبوں کی حالت

لیکن "دین" کی تمام خدمات کا بوجھ اسی غریب و نادار طبقہ کے سر پر ہے۔ مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کر کے اسے عذابِ قبر اور نارِ جہنّم سے بچنے کی دعائیں سکھا کر چلا جاتا ہے۔ شیخِ طریقت اپنا ٹیکس لے کر پاس انفاس اور ذکرِ خفی و جلی سے روحانیت بڑھانے کا "صراطِ مستقیم" دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآنِ کریم کے رزقِ کریم اور حیاتِ طیّبہ کے وعدوں کو عاقبت پر اٹھا کر اسے تھپک تھپک کر سلا جاتا ہے کہ یاد رکھو! وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ میں نے ایک

بہت بڑی مسجد میں جمعتہ الوداع کے وعظ میں سنا کہ "امام آخر الزمان کا ظہور اس وقت ہوگا جب مسلمانوں کا زوال و انحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گا۔ چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں ان پر چھا جائیں گی۔ امید کی کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں الٹا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کا زوال آخری حد تک نہیں پہنچا۔ جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائے گی، آنے والا آئے گا اور تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ جو لوگ کچھ آسودہ حال ہیں ان پر ان "محافظینِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین" کی نظرِ کرم اور قسم کی ہے۔ آئے دن آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیئے۔ ان مقتدیانِ دین نے اپنے اپنے مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے ہزاروں روپے ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرا دیئے جاتے ہیں۔ جماعتِ مخالف کے آئمہ و مشائخ، علماء و اسلاف کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ مقدمے چلتے ہیں۔ دونوں طرف سے ہزارہا روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دینے والے اسے "فی سبیل اللہ" سمجھ کر جنت کے خریدار بنتے ہیں، لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھئے کہ اللہ نے اس سلسلۂ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لئے تخلیق کر کے، اسے انسان کیلئے مسخر کر دیا۔ پھر ان انسانوں میں سے امتِ مسلمہ کو خیر امت کہہ کر اس مقصد کی تحصیل کے لئے انہیں چن لیا۔ تو کیا وہ مقصدِ عظیم، وہ نصب العین جو فاطرِ کائنات نے اس اجتباء و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا، اس کا حصول اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیئے یا باآوازِ بلند۔ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ دراصل قصور ان کا بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے۔ اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی بنیاد غلط ہے۔ فلاح و سعادت کو اُخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے بلکہ محض نظری لحاظ سے پرکھا جائے یعنی ایمان و اعمالِ صالح کی پہچان، حسنِ مآب، نیک انجام، کامیاب زندگی، حیاتِ طیبہ، استخلاف فی الارض نہ ہو۔ بلکہ اس کی سند اس قسم کے سرٹیفکیٹ ہوں جو مصری خلفاء کے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا۔ تبدیلی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

مذہب پرست طبقہ کی حالت

آپ اس طبقہ کو چھوڑیئے جو اسلامی مناسک و عبادات پر عامل نہیں۔اس طبقہ کو دیکھئے جو ان عبادات پر کاربند ہے۔ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔قرآن کریم نے انہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲۳ : ۱-۱۱) انہی کے لئے آیا تھا۔پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے افلح و اصلح ہونے کے ناکام و نامراد ہوتے جا رہے ہیں کیا محض اس لئے نہیں کہ یہ "کامیابی" یہ "فلاح و صلاح" محض آخرت سے منسلک کر دی گئی ہے۔قرآن کریم نے کہا تھا:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ : ۲)

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے یعنی ایمان لائے اور اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔ان سے ان کی برائیاں دُور کر کے ان کی حالت کو بہتر بنا دیا جائے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے صالح کہا جاتا ہے اس کی زندگی انتہائی قابلِ رحم گزر رہی ہے۔کیا انہوں نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ لیکن ان حضرات کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔انہوں نے اپنے آپ کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام صرف حیاتِ آخرت ہے یہ دنیا نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآن کریم میں ہے:۔

بد اعمال لوگ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے کہ ان سب کا مرنا اور جینا، حیات و ممات یکساں ہو جائے یہ بہت بُرا فیصلہ ہے (جو یہ کئے بیٹھے ہیں) (۴۵/۲۱)

صالح اور غیر صالح کی زندگی

یعنی قرآن کریم کی رُو سے ایک مومن و صالح کی زندگی ایک بد اعمال کی زندگی کے برابر نہیں، بلکہ متمیز اور ذی شان ہونی چاہیئے۔یہ خدائے تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی اور گمراہی پر ہے۔لیکن

کیا واقعی آج ان کی زندگی، جنہیں مومن و صالح کہا جاتا ہے، بداعمال کفّار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے؟ واقعات تو اس کے خلاف بتاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اعمال و ایمان کے صلے میں رزقِ کریم، عزّت و آبرو کی روٹی (۵۰ : ۲۲) دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر آج یہ کیوں ہے کہ سب سے زیادہ ذلّت و رسوائی کی روٹی مسلمان کو مل رہی ہے؟ یہ محض زیبِ داستاں نہیں، بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روٹی کی خاطر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے ذلّت و خواری کے وہ منازل طے کرنے پڑتے ہیں جن کے تصوّر سے شرافت کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ زبوں حالی اس لئے ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے۔ بجا اور درست؟ لیکن اس "اسلام چھوڑنے" کی تفصیل کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھ گئے ہیں۔ ڈاڑھی منڈانے لگ گئے ہیں۔ ان کے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں۔ وغیرہ ذالک۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب انداز صحیح اور درست ہیں اور جو آپ کے معیار کے مطابق "پکّے مومن" ہیں وہ کونسی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ جس طرح جی چاہے اپنے آپ کو خوش کر لیجئے لیکن یہ ساری خرابی اس نظریئے کی ہے جو اسلام کے ضعف و انتشار کے زمانہ میں پیدا ہوا اور جس کی رُو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف، انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو جگا جگا کر، جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو! دنیا کی ذلّت و خواری خدا کا عذاب ہے یہاں کی شوکت و حشمت کی زندگی عین اسلامی زندگی ہے۔ مسلمان دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ عزّت و وقار، جاہ و سطوت، سربلندی و سرفرازی، اس کے اعمالِ صالح کے لازمی

علاج

نتائج ہونے چاہئیں۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صُورت اسلامی ہو تو ہو انکی روح ہرگز اسلامی نہیں جو یہاں ذلیل ہے اور اس ذلّت پر قانع، وہ آخرت میں معزز نہیں ہو سکتا۔ جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اس رسوائی میں مطمئن ہے اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی۔[1]

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷:۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔

یقین مانیئے کہ اس تعلیم کی اشاعت میں آپ کی سخت سے سخت مخالفت ہو گی۔ معتقدات کا چھڑانا افیون چھڑانے سے کم نہیں ہوتا۔

گرفتم حضرتِ مُلّا ترش روست　　نگاہش مغز را نشناسد از پوست

---

[1] ان امور کی تفصیل "اسبابِ زوالِ اُمت" میں دیکھیے۔

اگر با ایں مسلمانی کہ دارم مرا از کعبہ می راند حق اوست

لیکن اگر آپ کو تسلیم ہے کہ یہ تبدیلی ازلیس لابدی ہے تو کسی مخالفت کی پرواہ نہ کیجئے۔ کہیئے اور برملا کہیئے! بردار تواں گفت۔ بہ منبر نتواں گفت " ایک دفعہ اس "اسلامی رہبانیت" کے اعتقاد کو توڑ دیجئے اور صحیح اسلامی تعلیم سامنے لے آئیے پھر دیکھئے کہ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوٰتیں وہی نتائج پیدا کرتی ہیں یا نہیں، جو ایک مومن کی اس دنیا کی زندگی کے خصوصی امتیازات ہیں۔ اور آخرت کا تو پھر پوچھنا ہی کیا؟ جب خدا کی کتاب زندہ ہے۔ اس کے اندر اس کے رسولؐ کا اسوۂ حسنہ زندہ ہے، تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل کرنے والی قوم دنیا میں زندہ نہ ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی اس قوم کو ہے۔ اس لئے کہ بقاءِ للاصلح فطرت کا قانون ہے اور اس قوم کا ہر عمل عملِ صالح ہے جو اس کے اندر زندہ و پائندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ اقوامِ مغرب نے فطرت کے اسی اصول کو، اللہ تعالےٰ کی سنتِ جاریہ کو، بھانپ لیا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چند دنوں میں جو نتائج برآمد ہوگئے ظاہر و باہر ہیں۔ لیکن ان کی بدبختی کہ وہ اپنے نظامِ زندگی کو خدا کے متعین فرمودہ مستقل اقدار کے تابع نہ رکھ سکے۔ اس لئے ان کا نظام' انسانیت کے لئے ممدِ حیات ہونے کے بجائے وجہِ ہلاکت بن گیا۔ لیکن بایں ہمہ' انہیں وہ قوتیں تو حاصل ہوگئیں جن کی وجہ سے آج تمام دنیا کے مسلمان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ناپائیدار ہی سہی، تسخیرِ فطرت تو ہوئی۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد سے تو ان کی یہ حالت ہوگئی کہ:۔

ع قصے سے امت بے چاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ ہو جاتے تو پھر اس جنتِ ارضی کا پوچھنا ہی کیا تھا؟ ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گذر ہی نہ ہو۔ جس میں یورپ آج گزر رہا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض، یعنی اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مسلم و غیر مسلم سب حکومتیں گرفتار ہیں۔

یاد رکھئے! جس ایمان و عمل صالح کا جیتا جاگتا، زندہ و پائندہ نتیجہ اس دنیا میں "خدا کی بادشاہت" کا قیام نہیں۔ یعنی جماعتِ مومنین کا استخلاف فی الارض نہیں، ضابطۂ الٰہی کے مطابق جہاں بانی و جہاں رائی نہیں وہ ایمان قرآنی ایمان نہیں وہ اعمال اسلامی اعمال نہیں۔ انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے۔ نگاہ کا پھیر ہے۔ مسلمان کے لئے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے۔ باقی سب فریبِ نظر ہے ابلیس کے دھوکے ہیں۔

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردار خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

عاطف طفیل
ایم۔ ایس سی۔ فزکس

منڈی کا دین

دین:۔ (مادہ د۔ ی۔ ن)۔ یہ مادہ بڑا وسیع المعنی ہے۔ اس میں ایک طرف غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، ٹھوس نتائج، جزا و بدلہ کا مفہوم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ اطاعت وفرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز اس سے مراد عادتِ مستمرہ بھی ہوتی ہے۔ یعنی ایسی روش جو التزاماً دیسی ہی رہے۔

کہنے کو ہم مسلمان ہیں اور ہمارا دین اسلام ہے۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری عملی زندگی سے اس کا دور دُور تک کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے روزمرہ معمولات اور بین الشخصی تعلقات پر جو ازم آجکل مسلّط ہے، اسے MARKETING ORIENTATION کہہ سکتے ہیں۔ اُردو میں اسے منڈی کا دین کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس دین میں اصولی طور پر "قدرِ تبادلہ" کو "قدرِ استعمال" پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ قدرِ تبادلہ یا ایکس چینج ویلیو (EXCHANGE VALUE) کا نظام ہی ہماری اجناس کی منڈی یا محنت کی منڈی کو چلاتا ہے۔ اس نظام کی اساس طلب و رسد کے قانون پر ہوتی ہے۔ اس کے مطابق وہی جنس (COMMODITY) تیار کی جاتی ہے جس کی طلب بازار میں موجود ہوتی ہے۔ خریدار کی پسند و ناپسند ہی اشیاء کی "قسمت" کا فیصلہ کرتی ہے۔ ایکس ویلیو کا یہ نظام جو ہماری اجناس کی منڈی پر حکمران ہے، غیر محسوس طور پر ہماری انسانی زندگی پر بھی اثر انداز ہو چکا ہے۔ قدرِ تبادلہ کا یہی سوداگرانہ نظام اب ہماری روزمرہ زندگی اور بین الشخصی تعلقات کے لئے بھی آدرشی نظام بن چکا ہے۔ اس نظام کی رُو سے انسان بھی برائے فروخت شے (SALABLE COMMODITY) بن کر رہ گیا ہے۔ آج اجناس کی منڈی کی طرح اشخاص کی منڈی (PERSONALITY MARKET) بھی وجود میں آچکی ہے۔ کلرک، ڈاکٹر، انجنیئر، آرٹسٹ اور دوسرے کارکن اپنی قیمت لگوانے منڈی میں موجود ہوتے ہیں۔ جسے منڈی کا بھاؤ مل جاتا ہے وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور جس پر کسی کی نگاہِ انتخاب نہیں پڑتی وہ مایوس اور بسا اوقات احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی عزتِ نفس مجروح ہو

جاتی ہے۔ معروف امریکی ماہر نفسیات ایرخ فرام ایسے ہی بکاؤ انسان کو (COMMODITY MAN) کہتا ہے اور اس کے متعلق لکھتا ہے:

"COMMODITY MAN HOPEFULLY DISPLAYS HIS LABEL, TRIES TO STAND OUT FROM THE ASSORTMENT ON THE COUNTER AND TO BE WORTHY OF THE HIGHEST PRICE TAG, BUT IF HE IS PASSED BY WHILE OTHERS ARE SNAPPED UP HE IS COVICTED OF INFERIORITY AND WORTHLESSNESS."

احساسِ کمتری اور نااہلیت کے جذام سے بچنے کے لئے والدین اپنی اولاد کو عہدِ طفولیت سے ہی خریداروں کی طلب میں زندہ رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ انہیں نہایت ہی لطیف طریقے اور حسین انداز میں بتایا جاتا ہے کہ تمہارے لئے اسوۂ حسنہ اشتہاری کمپنیوں کے ماڈلز ہیں۔ انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ دنیا میں کامیاب زندگی گذارنے کے لئے انہیں اپنی شخصیات کور بوائے (COVER BOY) اور کور گرل (COVER GIRL) کے مطابق تشکیل کرنا ہوں گی۔

دورِ جدید کے اس دین کی گورننگ فورس گذشتہ ادوار کی طرح مجسّم اور مشخص نہیں ہوتی بلکہ تجریدی اور نادیدہ ہوتی ہے۔ گئے دَور کے منصب دار آقا، بادشا، آمر یا باپ کی شکل میں ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے خلاف بغاوت کی جاسکتی تھی جب کہ اس منڈی کے دین کی اتھارٹی منافع اور رائے عامہ ہے جو نظر نہیں آتے اس لئے ان کے خلاف بغاوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی شخصیت ان غیر محسوس دیوتاؤں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر اپنے تخلیقی امکانات کی تکمیل کے محرکات سے محروم ہوجاتی ہے۔ نئے آقا انسان کو ہجوم میں گم ہوجانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا جرم اپنی انفرادیت اور" وفاداری بشرطِ استواری" کو قائم رکھنا ہے۔ جہانِ نو کے اس دین میں وفاکیشی کا مرجع فہمِ عامہ، منافع اور رائے عامہ ہوتی ہے اور بس۔

ہماری ثقافت بھی اسی منڈی کی ثقافت بن چکی ہے جہاں خوبصورتی، خوب سیرتی، اچھائی اور نیکی کے تمام معیار یا تو اشتہاری کمپنیاں تشکیل دیتی ہیں یا ہمارے نام نہاد مذہبی پیشوا، جن کی بنیاد پر آج کا انسان" اقدارِ زندگی" سے مُنہ موڑ کر" معیارِ زندگی" کے گرداب میں پھنس چکا ہے۔ بظاہر یہ معاشرہ مشینی پُرزوں کا ورکشاپ ہے یا بے شعور حیوانوں کا ریوڑ ہے۔ اس ریوڑ میں ہر شخص لکیر کا فقیر ہے کیونکہ اسے اندیشہ ہے کہ جونہی وہ اس ہجوم کے رواجوں سے علیحدہ ہوا، محفوظ نہیں رہے گا۔ ایسے معاشرہ میں سبھی رشتے تاجرانہ ہوتے ہیں جو VESTED INTERESTS مفاداتِ مزعومہ کی بنیاد پر پروان چڑھتے ہیں اور انہی پر قائم رہتے ہیں۔

ایک طرح سے یہ میکینیکل اور بیوریوکریٹک بندھنوں کا ہنگامہ خیز اجتماع ہوتا ہے جس کے شور میں ہر شخص مفاد پرستی کی اندھی دوڑ میں دیوانہ وار دوڑتا چلا جاتا ہے۔

قرآن حکیم اس بیوپاری اور ساہوکار سماج کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس معاشرے میں ایک انسان دوسرے انسان سے اس طرح الگ ہوجاتا ہے جیسے ان میں کسی نے (WEDGE) ٹھونک دی ہو۔

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲:۳۶)

عدی دو لکڑیوں کے درمیان (WEDGE) کو کہتے ہیں۔ اس لئے عدو کے معنی ہیں ایسے لوگ جو ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں۔ ان میں ناہمواریاں ہوں۔ متعاد (ایسی ناہموار جگہوں کو کہتے ہیں جو آپس میں ملتی جلتی نہ ہوں) اس کے بعد ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ بھائی سے بھائی جدا ہوجاتا ہے۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ (۸۰/۳۴)، اولاد ماں باپ سے جدا ہوجاتی ہے۔ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ (۸۰/۳۵)۔ حتٰی کہ میاں بیوی، باپ بیٹے کے مفاد تک بھی ایک دوسرے سے متصادم ہوجاتے ہیں۔ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ (۸۰/۳۶) ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے حصول اور تحفظ میں ایسا جذب ہوتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر ہی نہیں رہتی۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ (۸۰/۳۷)۔ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ مشترکہ مفادِ انسانیت کی بجائے اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لئے الگ الگ پروگرام بنائے۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ (۷۴/۵۲)۔ اس نظریہ کے ماتحت جو کچھ افراد میں ہوتا ہے وہی کچھ اقوام میں ہوتا ہے۔ اس کی رُو سے ہر قوم کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کردے۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا (۷/۳۸)۔ اس ہنگامی زندگی میں ہر قوم دوسری قوم کو محروم کردینے کی فکر میں ہے (لعن کے معنی ہیں دور رکھنا، محروم کردینا)۔

اس غیر انسانی (INHUMAN) اور انسانیت سوز نظام کے تابع معاشرے کا مآل کار الم انگیز تباہی اور ہلاکت آفرینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی الم انگیز تباہی و بربادی کے اسباب دریافت کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے کہ جب ان کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی مرضی ہے۔ اس نے ایسا کردیا ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے دے، جسے ذلیل کردے۔ (فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝ (۸۹/۱۶)۔ قرآن کہتا ہے کہ كَلَّا (۸۹/۱۷) بالکل غلط یہ ان کا فریب نفس ہے جو حقیقت کو سامنے نہیں آنے دینا چاہتا ہے اور اپنی زندگی کی غلط روش کے خدا کی طرف منسوب کرکے اپنے آپ کو اطمینان دلے لینا چاہتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خوشگواریا ناخوشگوا

نتائج یا جو کچھ بھی تمہاری زندگیوں میں ظاہر ہوتا ہے، یہ اوّل سے آخر تک تمہاری انفرادی اور اجتماعی غلط یا صحیح سوچ اور روش کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ خدائے رحمان ظالم نہیں کہ وہ افراد اور اقوام کو ان کے ناکردہ گناہوں کی سزا دے۔ ایسا کرنا یقیناً ظلم ہے۔ لیکن ظلم کا خدائے قدوس کے ہاں کوئی تصور نہیں۔ قرآنِ حکیم ان افراد و اقوام کی نفسیاتی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہاری ذلت و رسوائی کا سبب یہ ہے کہ تم نے ایک ایسا استحصالی معاشرہ قائم کر رکھا ہے جس میں عزت و تکریم کا اہل صرف وہ سمجھا جاتا ہے جس کے پاس بہت مضبوط جتھہ یا جماعت ہو لیکن جو شخص تمہارے معاشرے میں اکیلا یا تن تنہا ہو، اس کے ساتھ کوئی پارٹی نہ ہو وہ عزت و تکریم سے محروم اور بے یار و مددگار رہتا ہے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص اس کا والی وارث نہیں بنتا (۸۹/۱۷)۔

قرآن کہتا ہے کہ تمہارے ذلیل اور رسوا ہونے کا سبب یہ ہے کہ تمہارے معاشرے کی حالت یہ ہے کہ تم میں سے جس شخص کی چلتی ہوئی گاڑی رُک جائے جس کی حرکت مبدّل بہ سکون ہو جائے اس کے لئے کھانے پینے کا انتظام کرنا اور اس کی عزت و تکریم کا دفاع کرنا، اس کے لئے تمہارے ہاں نہ کوئی قدر ہے اور نہ کوئی قانون۔ سورہ الفجر (۸۹/۱۸)۔

پھر قرآن کہتا ہے کہ تمہارے زوال کا سبب یہ ہے کہ جو کچھ مرنے والوں سے تمہارے ہاتھ لگ جاتا ہے اس سب کچھ کو صرف اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر رکھ لیتے ہو۔ مزید برآں تم ایسا قانونی جال بُن لیتے ہو کہ اِدھر اُدھر جہاں کہیں بھی مال و منال پیدا ہوتا ہے وہ انجام کار تمہارے گڑھوں میں جا گرتا ہے (۸۹/۱۹-۲۰)۔ گویا جس طرح بارش کا پانی نشیبی گڑھوں میں خود بخود گرتا ہے، اسی طرح استحصالی معاشرہ میں تمام وسائلِ آمدن کا رُخ اور بہاؤ بھی سرمایہ داروں کے گھروں ہی کی طرف ہوتا ہے۔ ہر سرمایہ اور ہر پیداوار پکے ہوئے پھل کی طرح سرمایہ داروں کی جھولی میں جا گرتی ہے۔

قرآن ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے کہ ایسے استحصالی معاشرے کا انجام جہنّم کی تباہیوں کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا۔ یہ جہنّمی معاشرہ جہنّم کی آگ میں جل کر رہے گا۔ یہ آگ کہیں باہر سے نہیں آئی بلکہ یہ آگ وہی دولت ہے جو انہوں نے ناجائز ذرائع سے حاصل کی تھی اور پھر اسے اپنے ذاتی مفادات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اسی دولت نے اس تباہ کُن آگ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی آگ سے آج ان کے زخموں کو داغا جائے گا (۹/۳۵)۔ یہ وہی آگ ہے جو انہوں نے ناجائز دولت جمع کرنے کے لئے بڑے بڑے پروگراموں اور اسکیموں کی صورت میں اپنے لئے تیار کی تھی۔ آج اسی آگ کے ستونوں کے ساتھ انہیں باندھا جائے گا۔ وہی آگ ان کے دلوں پر چڑھ رہی ہے (۱۰۴/۶-۷)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت انسانیت کی سطح تک پہنچے ہی نہ تھے۔ ان کی زندگی حیوانی سطح کی زندگی تھی جو کھانے پینے اور طبعی موت مرجانے سے عبارت تھی۔ اس زندگی کا لازمی نتیجہ سُلگتا ہوا جہنم ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (۴۷/۱۲)

اسلم رانا

نظامِ ربوبیّتِ عامہ

تم ہمارے قانونِ مکافات کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جن زندہ اور مُردہ انسانوں کو تم اپنا کارساز اور کارفرما سمجھتے ہو وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنے اعمال کے بوجھ کے نیچے بُری طرح دب رہا ہو اور کسی اور کو بلائے کہ وہ اس کا کچھ بار بٹا لے تو کوئی شخص ایسا نہیں کر سکے گا، خواہ وہ اس کا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔ (یہ ہے ہمارا قانونِ مکافات۔ اب تم خود سوچو کہ اگر تم غلط روش پر چلو گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے کس طرح بچ سکو گے)۔

لیکن اس تنذیر سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قانونِ مکافات کے اَن دیکھے نتائج اور زندگی کی ان غیرمرئی حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہوں، جن کی رُو سے اعمال کے نتائج سامنے آتے ہیں، اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں۔ اور اس طرح اپنے غلط اعمال کے عواقب سے ڈرتے ہیں اور اس سے بچنے کے لئے وہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں، اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جو دوسروں کی نشوونما کرتا ہے اس سے خود اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور ان کے تمام معاملات قانونِ خداوندی کے مطابق طے پاتے اور تکمیل پذیر ہوتے ہیں اور وہی ان کی آخری پناہ گاہ ہوتا ہے (۳۵/۱۸)۔

لہٰذا تم امکان بھر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، نظامِ خداوندی کے احکام کو اچھی طرح سے سُنو اور ان کی اطاعت کرو اور اپنی کمائی کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اس سے تمہاری نگاہ میں کشادگی پیدا ہو جائیگی جس سے تم اس کوشش میں نہیں لگے رہو گے کہ دوسروں کو پیچھے دھکیل کر خود آگے بڑھ جاؤ اور اس طرح سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لو۔ مفادِ خویش کی تنگ نظری انسان کو یہی سکھاتی ہے کہ کھیتی اسی کی سرسبز ہوتی ہے جو دوسروں کی پرواہ کئے بغیر اپنے کھیت کو سیراب کر لے (۶۴/۱۶) اور ہمارا قانونِ ربوبیت یہ ہے کہ کھیتیاں انہی کی پروان چڑھتی ہیں جو دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیں (۵۹/۹)۔ اس انداز سے دینے والے وہ لوگ ہیں جو اپنا مال دن رات

کے بندوں اور خاموشی سے اس مقصد کے لئے خرچ کرتے ہیں تو انہی کی قربانیوں سے وہ نظام قائم ہوتا ہے جس میں نہ کسی کو کسی کا خوف و خطرہ رہتا ہے اور نہ ہی افسردگی اور غم گینی (۲/۲۷۴)۔ اے رسولؐ! تم ان لوگوں کو نظامِ خداوندی کی راہ دکھا دو، تمہارے ذمہ اتنا ہی ہے۔ انہیں اس راستہ پر چلا دینا تمہارے ذمہ نہیں (۵/۹۹)۔ کسی کا صحیح راستے پر چلنا خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جس کی رُو سے اس نے انسانوں کو اپنے لئے آپ راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ تم ان لوگوں کو اتنا بتا دو کہ تم جو کچھ بھی اس ضمن میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ خود تمہاری اپنی ذات کو ہوگا۔ بشرطیکہ یہ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے لئے خرچ کیا جائے، اس کا جذبۂ محرکہ کچھ اور نہ ہو۔ یوں جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا، اس میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی (۲/۲۷۲)۔

قرآن نے دیگر مقامات پر نظامِ خداوندی کے لئے خرچ کرنے کو قرض سے تعبیر کیا ہے۔ ویسے تو قرض اس مال کو کہتے ہیں جو واپس لینے کے لئے دیا جائے لیکن نظامِ خداوندی میں اس کی واپسی میں ایک خاص نکتہ پنہاں ہے۔ جگالی کرتے ہوئے جانور کو سامنے لائیں۔ خام چارہ کا گولا ابھر کر اس کے مُنہ میں آجاتا ہے تو جانور آنکھیں بند کئے بڑے مزے اور سکون سے خام چارے کے گولے کو چبا چبا کر قابلِ ہضم بنا کر واپس معدے کو لوٹا دیتا ہے۔ اس کو قریض کہتے ہیں یعنی تم جو کچھ کسی پر خرچ کرتے ہو نظامِ ربوبیت اسے قابلِ ہضم صورت میں تمہیں لوٹا دیتا ہے۔ اگر تم معاشرے کا توازن قائم کرنے کے لئے کچھ دیتے ہو تو وہ تمہیں دُگنی شکل میں واپس مل جاتا ہے اور تمہاری حفاظت کا سامان بن جاتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا نظامِ ربوبیت خود کچھ نہیں رکھ لیتا بلکہ تمہاری محنتوں کو اس طرح خوشگوار نتائج سے بھرپور کر دیتا ہے جیسے بکری کے تھن، جو دودھ سے لبریز ہوں کہ ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپک رہے ہوں (۶۴/۱۷)۔ تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا کا قانونِ ربوبیت بڑی قوتوں کا مالک ہے، اس کا غلبہ دھاندلی کا غلبہ نہیں ہوتا بلکہ یکسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی کوئی اور طاقت اس پر غالب آجائے اور اسے نتائج مرتب کرنے سے روک دے۔ اس لئے خدا کے اس غالب اور پُر حکمت قانونِ ربوبیت کے مطابق مستقبل کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے اپنی محنت کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دینا چاہیئے (۶۴/۱۸)۔

حضورِ پُر نور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے ان گوہر پاروں پر مبنی ایک ایسا عدیم النظیر جمہوری نظام دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں نہ تو کوئی حکمرانوں کا طبقہ تھا اور نہ ہی اس کا دستور عوام کی رائے سے مرتب کردہ تھا بلکہ اس نظام کا دستور از روئے وحی اللہ تعالیٰ کا تلقین کردہ تھا جس میں ہر طرح کی آزادیٔ ضمیر تھی۔ مملکت ہر لحاظ سے رفاعی تھی جس میں عمرؓ فاروق اعظم جیسا جلیل القدر انسان راتوں کو گردش کر کے دیکھتا تھا کہ کہیں ظلم تو نہیں ہو رہا یا کسی غریب کے گھر فاقہ تو نہیں۔ اگر کوئی غریب گھرانہ نانِ شبینہ کا محتاج دکھائی دیا تو بیت المال سے اپنی پیٹھ پر لاد کر سامانِ خورد و نوش معذرت کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اگر کسی امیر یا گورنر نے کسی ذمی پر ذرہ بھر ظلم کیا تو عمرؓ کے دُرّے اس پر برسرِ عام برس گئے۔ لیکن افسوس

کہ افراد کی اقتدار پسندی نے اس نصب العینی نظام کو زیادہ دن قائم نہ رہنے دیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے تھوڑا عرصہ بعد امیر معاویہ نے خلافت کو سلطنت میں بدل دیا۔

خلافت کے سلطنت میں تبدیل ہو جانے کے ساتھ ہی ملوکیت کے انداز شروع ہو گئے جس سے سیاسی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کا لائحہ عمل رفتہ رفتہ گل دستۂ طاقِ نسیاں بن گیا۔ ملوکیت کے دباؤ نے علماء کی زبانیں بند کر دیں، سلطانِ فاسق و جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے والا کوئی نہ رہا اور علماء دین کا تمام تر تفقہ افراد کے شخصی معاملات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے باوجود صدیوں تک مسلمانوں میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی رہی لیکن عملی سیاست میں عوام تو ایک طرف خواص کو بھی کوئی دخل نہ رہا اور عوام کے لئے یہی نصیحت رہ گئی کہ اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو اس کی تردید نہ کرو بلکہ تائید میں کہو کہ ہاں مجھے بھی ستارے نظر آ رہے ہیں۔ سعدی نے بھی لوگوں کی یہی مصلحت اندیشی سکھائی کہ:

خلاف رائے سلطان رائے جستن
بخون خویش باید دست شستن

حافظ نے بھی یہی کہا کہ:

رموزِ مملکت خویش خسروان دانند گدائے گوشہ تو حافظا مخروش

بڑے بڑے مقدس ائمہ دین نے بھی یہی کہا کہ سلطانی اگرچہ اسلامی چیز نہیں لیکن بدکردار سلاطین کی بھی اطاعت لازمی ہے۔ خوش آمدی درباریوں اور امراء نے بادشاہ کو ظلّ اللہ قرار دے کر دین کے معاملے میں مجتہدِ اعظم بنا دیا۔

اسلام اس قدر انقلاب آفریں اور فلاح کوش تحریک تھی کہ کوئی چھ صدیوں تک مسلمان اسلام سے بہت کچھ گریز کرنے کے باوجود اقوامِ عالم میں پیش پیش رہے۔ اسلامی زاویۂ نگاہ کا جو قلیل حصہ بھی حیاتِ اجتماعیہ میں باقی رہ گیا تھا اتنے حصہ نے بھی ملّتِ اسلامیہ کو اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود معاصرانہ زندگی میں دوسروں سے کچھ قدم آگے ہی رکھا تھا۔ اسلام کی پہلی چھ صدیاں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں تاریخی انسانی کا ایک روشن باب ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپ کی سیاسی قوت اس قدر ضعف پذیر تھی کہ یورپ کے تمام ممالک اپنے عساکر جمع کر کے بھی فلسطین میں ایک مسلمان مجاہد سلطان کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کہ مغربی یورپ میں اُندلس پر مسلمان قابض ہو گئے۔ جہاں انہوں نے ایک عظیم الشان تہذیب و تمدن پیدا کیا جو تمام یورپ کے لئے قابلِ رشک تھا۔ یورپ سے علوم و فنون کے شائق اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مسلمانوں ہی سے مغربیوں نے طبیعی اور تجربی سائنس کا علم سیکھا۔ مسلمانوں کے علوم و فنون کا مدار تجربے اور مشاہدے پر تھا، ریاضیات جو طبیعات کی اساس ہے کہ بعض اہم شعبوں کے موجد مسلمان ہی ہیں بلکہ انہوں نے الجبرا بھی ایجاد کیا تھا۔ یورپ میں علمِ حساب اپنی ابتدائی صورتوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا، مسلمانوں نے ان کو صفر

کا ہندسہ دیا جس سے گنتی لامتناہی تک پہنچ گئی۔ اہلِ مغرب صفر کو عربی رقم کرتے ہیں حالانکہ یہ ہندسہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے حاصل کیا تھا جن کے سر پر اس کی ایجاد کا سہرا ہے۔ سارٹون نے تاریخ سائنس کی ایک ہبسوط کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ریاضیات اور تجربی سائنس میں مسلمانوں کے کارناموں کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مغرب کو عصرِ حاضر میں جو عروج اور قوت حاصل ہوئی ہے۔ وہ زیادہ تر تجربی سائنس ہی کی رہینِ منت ہے جس کی ابتدا مسلمانوں نے کی ـــــ لیکن ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد مسلمانوں کی ترقی رُک گئی ـــــ اور علوم و فنون کی یہ مشعل فرنگ کے ہاتھ میں آگئی جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

بجھ کے شمعِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کا طلسم تو توڑا تھا لیکن بہت جلد ان کے تختِ ملوکیت پر خود متمکن ہو گئے اور قیصریت کے جاہ و جلال کو اپنی شاہانہ شوکت سے مات کر دیا۔ فرعون کے آبنوسی تخت کی جگہ ۹ کروڑ روپے کا تخت طاؤس شانِ اسلام کا مظہر بن گیا۔ ملوکیت کے عروج نے جہاں افرادِ امت کی حریت سوخت کی وہاں تحقیق و اجتہاد کے دروازے بھی بند کر دیئے۔ غیر اسلامی طرزِ زندگی، اسلام کی سادہ زندگی پر اثر انداز ہونا شروع ہو گئی۔ جس نے اسلامی افکار میں غفلت پیدا کر دی، انقلابی مشیت (نظامِ ربوبیت) میں خلل پیدا ہو گیا، عقل و ہوش اور رسم و راہ سب دگرگوں ہو گئے۔ غرضیکہ اسلام کے عدیم النظیر انقلاب کو ملوکیت کھا گئی۔ ظالم اور مستبد سلاطین ظل اللہ بن گئے اور علماءِ سُو فقیہہ اور فتویٰ فروش بن کر اُن کے آلۂ کار بن گئے۔ جس طرح رومۃ الکبریٰ کے شہنشاہ دیوتا بن گئے تھے اور رعیت کے ہر فرد پر ان کی پوجا لازم تھی، اسی طرح مسلمان سلاطین علماء سے سجدہ کرانے لگے اور علماء سے فتویٰ حاصل کر لیا کہ یہ سجدہ تعظیمی ہے، سجدہ عبادت نہیں۔ شاہ پرستی کی ان عجمی روایات نے افرادِ امت کو حریت، اخوت اور مساوات جیسے انمول جوہروں سے بیگانہ کر دیا۔ اس بیگانگی کے عالم میں وہ شخصیت پرستی، قبر پرستی اور پیر پرستی میں الجھ کر رہ گئے۔ حالانکہ اسلام نے ان میں ایسا اعتمادِ نفس پیدا کیا تھا کہ یہ اپنے تئیں نائبِ الٰہی سمجھ کر فطرت کے عناصر اور اس کی قوتوں سے مرعوب ہونے کی بجائے ان کو بلا استثناء قابلِ تسخیر سمجھتے ہوئے فطرت پر حکمرانی کرتے۔

دینی اور دنیوی معاملات میں چونکہ حدِ فاصل نہیں، اس لئے زندگی کا ہر شعبہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلامی عقائد کے زیرِ نگین ہوتا ہے اور دینِ اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جو انسان کے ہر تقاضے کی تکمیل کی ضمانت دیتا ہے۔ لیکن یہ نظام دوئی برداشت نہیں کرتا اور یہی بڑی وجہ اس نظام کے رُک جانے میں ہوئی ـــــ جونہی ملوکیت کے انداز شروع ہوئے، ملت دو امیروں میں بٹ گئی۔ سیاست پر سلطانوں نے قبضہ کر لیا اور دین علماءِ سُو کے سپرد کر دیا جنہوں نے اس کو مذہب میں تبدیل کر کے تحقیق و اجتہاد کے تمام دروازے بند کر دیئے جس سے اصول و فروع میں سوچنے والا

کوئی نہ رہا ـــ بس ـــ اسلاف کی کہی ہوئی باتوں کی فقط توضیع، تشریح اور حاشیہ نویسی علماء دین کا وظیفۂ حیات بن کر رہ گیا ـــ اور مسلمان فقط بے حضور نمازیں پڑھنے اور ظواہر و شعائر کی پابندی میں غلطاں رہے۔ قرآن نے مشاہدۂ کائنات کو عبادت قرار دیا تھا لیکن مسلمان قرآنی آیات کی تلاوت میں لگے رہے۔ عمل دوسروں نے کیا اور انہوں نے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، مسلمانوں کو بھی آدبوچا۔

چودھویں صدی عیسوی سے مسلمانوں نے اسلاف کی باتوں کی جگالی کے علاوہ علوم و فنون میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ اضافہ تو دُور کی بات ہے ـــ یہ تو دینی علوم کو ہی جامد اور فرسودہ کہہ رہے ہیں جس کی بنا پر اُمّت کی کشتیٔ حیات سراب میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ ہر طرف سے غیر محفوظ ـــ اسلام کا خدا ربّ العالمین اور اس کا نبی رحمت اللعالمین ہے۔ تنگ نظری نے خدا کو صرف ربّ المسلمین اور نبی کو صرف رحمت المسلمین بنا دیا۔ اگر کسی طور اسلام کو ان تنگ فقیہوں کے جمود اور ان کی رجعت پسندی سے نجات حاصل ہو جائے اور مسلمان صورت پرستی کی بجائے روح پروری پر آمادہ ہو جائیں تو پھر یہ دنیا کے سامنے جمہوریت کا ایسا نمونہ پیش کر سکتے ہیں جس کے سامنے انگریزوں اور امریکیوں کے نظام بازیچۂ اطفال نظر آئیں ـــ کیونکہ روحِ اسلام میں بہترین جمہوریت کے تمام عناصر موجود ہیں جنہیں "خاص اداروں میں مجتمع ہونے کی تلاش ہے"۔ اسلامی معاشرت اور اس کے نصب العین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے ان خاص اداروں کی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ فاروقِ اعظم نے ان خاص اداروں کو عملی طور پر قائم کیا تھا، یہ کارنامہ ایسا انسانیت ساز، انمول اور انقلابی تھا کہ تاریخِ عالم کا سنہرا باب تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن علماء سو نے جلد ہی اس کا افسانہ بنا دیا۔

یورپ، خصوصی طور پر سکنڈے نیویا میں حضرت عمرؓ کو مردم شماری کرانے اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کے لئے ماڈل کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اہل دانش و بینش احباب اس کا اعتراف کرتے ہیں ـــ مسلمانوں نے ان کے کارناموں کو تو افسانہ بنا دیا ـــ مگر مغربیوں نے اسلام کی سخت مخالفت کے باوجود اسلام کے بغور مطالعہ کے بعد اس پر عمل کر کے اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو درست کیا ہے اور صدیوں کے تجربے کے بعد وہی خاص ادارے قائم کر لئے ہیں۔ لہٰذا ان کا مطالعہ کرنا اور کسی حد تک ان پر عمل کرنا بھی مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

انسان سے ہٹ کر دوسری مخلوقات میں سے شہد کی مکھی کی مثال لیں کہ وہ کتنی آسانی سے اپنی نئی نسل کو چھتے کے انتظامی آداب کے متعلق معلومات سونپتی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

پھر ہر طرح کے پھولوں اور پھلوں سے رس چوستی پھرے اور نہایت فرماں پذیری اور اطاعت گزاری سے اس راستے پر چلتی جائے جو خدا کے قانونِ ربوبیت نے اس کے تجویز کیا ہوا ہے۔ (چنانچہ جب وہ قانونِ فطرت کا یوں اتباع کرتی ہے تو) اس کے اندر سے مختلف رنگوں کا رس (شہد) نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لئے (غذائیت کے علاوہ) شفاء بھی ہے۔

اس میں بھی ان لوگوں کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانی ہے جو فکر و تدبر سے کام لیں (وہ دیکھیں گے کہ ان مکھیوں کے نظام میں کس طرح ہر مکھی اپنی اپنی استعداد کے مطابق سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے مشترکہ بیت المال میں جمع کر دیتی ہے اور وہاں سے ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق سامانِ نشوونما ملتا رہتا ہے۔ یہی نظام اگر انسانی دنیا میں رائج کر لیا جائے تو اس سے ان بے شمار امراض سے شفا مل جائے جو انسانیت کو لاحق ہیں۔ اس نظام کی روشنی میں ذرا اپنی حالت پر غور کرو (۱۶/۶۹)۔

حضرت بابا فرید شکر گنجؒ نے کیا خوب فرمایا کہ عام طور پر پانچ رکن مشہور ہیں لیکن درحقیقت چھ رکن ہیں، مریدوں نے حیرت سے پوچھا کہ چھٹا رکن کونسا ہے؟ تو جواب دیا کہ "روٹی" اور یہ رُکن بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس رُکن کے گر جانے سے باقی پانچ کی بھی خیریت نہیں رہتی۔ سعدیؒ نے بھی یہی کہا کہ بھوکا حضورِ قلب سے نماز بھی نہیں پڑھ سکتا:

شب چو عقد نماز بر بندم　　چہ خورد بامداد فرزندم
خداوندی روزی بحق مشتغل　　پراگندہ روزی پراگندہ دل

انسانی زندگی چونکہ اپنے انداز بدلتی رہتی ہے اس لئے اس سے نو بہ نو صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اسلام جو سراپا حرکت اور ہمہ سمتی جدوجہد کا نام ہے تلقین کرتا ہے کہ اس میں سے کوئی صورت بھی قابلِ پرستش نہیں۔ اسلام انسان کی ذات کی ایسی نشوونما چاہتا ہے کہ جب وہ دوسرے عالم میں داخل ہو تو وہ قوی اور توانا ہو۔ قوی اور توانا انا (انسانی ذات) کے لئے صحت مند توانا جسم اور آزاد شعور کا ہونا اشد ضروری ہے۔ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی نہایت احسن انداز میں میسر آتی رہیں جہاں نہ کوئی دینے والا ہاتھ ہو اور نہ ہی کوئی لینے والا ہاتھ ـــ قرآنِ مجید میں ہے کہ:

"النفس و آفاق میں کارفرما یہ تمام پروگرام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ) جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔" (۹۱/۹)

جن قوموں نے اس نکتے پر غور و تدبر سے کام لیا انہوں نے پیغام کو پا لیا تو انہوں نے "فکرِ معاش جیسے عفریت کو مسخر کر کے انسانی روح کو آزاد کرا لیا۔ علامہ نے کہا ہے نا: قبض کی رُوح تیری دے کے تجھے فکرِ معاش"، نظامِ ربوبیت سے بہتر اور کون سا نظام ہو سکتا ہے جس میں انسانی ذات احسن انداز میں نشوونما پا سکے۔

نظامِ ربوبیت کے یہ خاص ادارے یوں تو مغرب کی متعدد اقوام نے قائم کر رکھے ہیں۔ تاہم میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ صرف دو سلطنتوں تک ہی محدود ہے۔ ویسے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سلطنتوں میں نظامِ ربوبیت فعال اور مؤثر ہے۔ ڈنمارک میں نظامِ ربوبیت کے یہ خاص ادارے دوسری جنگِ عظیم کے دوران متعارف ہوئے تھے اور انگلستان میں ۱۹۴۵ء میں متعارف ہوتے ـــ اس نظام کو فعال و مؤثر ہونے کے لئے وقت درکار تھا ـــ کہ ۱۹۷۰ء کی آمد پر دنیا

نے کروٹ بدلی۔ اس کروٹ میں یورپ نے عسرت سے عشرت کی طرف زقند بھری۔

دنیا میں ہر حکومت افراد کی کمائی سے جتنا حصہ لیتی ہے اس کا نام ٹیکس ہے اور اس کی وصولی کے لئے ملک کی پوری آبادی کا قومی رجسٹر میں درج ہونا ضروری ہے۔ (جب کہ حضرت عمرؓ نے مردم شماری اس مقصد کے لئے کرائی کہ کوئی فرد بھی از روئے اسلام اپنے حق سے محروم نہ رہ جائے)۔ ڈنمارک میں اس ٹیکس کو SKAT کہتے ہیں۔ یہ لفظ بہت ہی جامع ہے۔ اس کے معنی ہیں خزانہ، گودام، بیت المال اور نہایت پیاری چیز۔ ڈنمارک میں شہری رجسٹر ہے جس پر اس سلطنت کا ہر فرد مندرج ہے تاکہ کوئی فرد اپنے حق سے محروم نہ رہ جائے۔ ہر فرد اس بیت المال میں اپنی محنت کی کمائی سے زائد از ضرورت برضا ورغبت جمع کرا دیتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے کہ:

"اگر تم وسعت اور کشادگی چاہتے ہو تو اس کا طریقہ ہے کہ اپنی محنتوں کا عزیز ترین ماحصل ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔" (۳/۹۱)

ڈنمارک جو چند جزیروں پر مشتمل ہے، کی آبادی ۵۵ لاکھ ہے۔ یہ سلطنت چھوٹی چھوٹی بلدیہ میں منقسم ہے۔ صرف دارالحکومت کوپن ہیگن کی ۵۱ بلدیات ہیں۔ بلدیہ کی تشکیل میں یہ انتظام خاص طور پر دیا گیا ہے کہ ہر بلدیہ میں صنعتی علاقہ کے علاوہ زرعی زمین بھی شامل ہو۔ سلطنت میں ملکہ کے باوجود ایک مؤثر جمہوریت رائج ہے اور اس کا نام سوشل ہے۔ اس سلطنت کا بلند بانگ دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں سو فی صد خواندگی پائی جاتی ہے۔ یہ دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔

اس تمہید اور پس منظر کے ہمیں اپنے مقصود نظامِ ربوبیتِ عامہ کی طرف بڑھنا ہے۔ گو کہ نظام بذاتِ خود قانون ہوتا ہے اور اس کے نافذ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ تاہم یہ خاص ادارے اس کے نفاذ اور استحکام میں معاون ہی نہیں بلکہ مضبوط ستون ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بھرپور قوتِ نافذہ ہیں۔ ہر بلدیہ مرکزی نظام کی آئینہ دار ہے۔ لہٰذا البرٹ سلنڈ بلدیہ کی مشینری اور اس کے کل پرزے، جو نظامِ ربوبیت کے قیام اور استحکام کے لئے ہمہ تن منہمک ہیں، کو ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

البرٹ سلنڈ بلدیہ کا نمبر ۲۶۲۰ ہے، اس کی کل آبادی ۱۹۹۱ء کے مطابق ۲۹۵۵۵ ہے جس میں صفر سے چھ سال تک کے ۵۴۲ لڑکے اور ۴۴۶ لڑکیاں ہیں۔ سات سے سولہ سال تک کے ۲۲۰۶ لڑکے ۲۰۷۰ لڑکیاں ہیں۔ ۱۷ سال سے ۶۴ سال تک کے ۱۰۴۷۳ مرد اور ۱۰۵۱۲ عورتیں ہیں۔ ۶۵ سال سے اوپر ۵۶۷ مرد اور ۷۳۹ عورتیں ہیں۔ کل آبادی کے لئے ۲۴ ڈاکٹر اور ۴ سپیشلسٹ ہیں۔ جانوروں کے لئے ایک کلنک اور تین ڈاکٹر ہیں اور گیارہ دندان ساز ہیں۔

صفر سے تین سال کے بچوں کے لئے آٹھ گہوارے ہیں جہاں ۳۲۸ بچوں کے لئے جگہ ہے۔ اس کے علاوہ ایسی عورتیں بھی ہیں جو اپنے گھروں میں بچے رکھتی ہیں۔ یہاں ۳۵۰ بچوں کی گنجائش ہے۔ ۳ سے ۶ سال تک کے بچوں کے لئے ۱۸ نرسریاں ہیں جن میں ۸۵۴ بچے سما سکتے ہیں۔ ۱۹ ایسے دفاتر ہیں جو بچوں کے فارغ اوقات کو مصرف میں لانے

کی تدابیر کرتے ہیں۔ ۱۵ مرکب اور مخلوط قسم کے انسٹی ٹیوٹس ہیں جن میں ۸۰۴ بچوں کی تربیت کا انتظام ہے۔ نوعمروں کے لئے کلبیں ہیں جہاں ٹیوشن کے علاوہ گیمز بھی ہوتی ہیں۔

۷ سکول ہیں جن میں ۱۵ نرسری (پکی) کی کلاسیں ہیں جن میں ۲۸۶ بچوں کے لئے انتظام ہے۔ پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک کے لئے ۱۱۷ کلاسیں ہیں جن میں ۲۴۰۹ بچوں کی تدریس کا بندوبست ہے۔ ۸ سے ۱۰ویں جماعت تک کے لئے ۳۵ کلاسیں ہیں جہاں ۲۷۰ بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ۱۴ خصوصی کلاسیں ہیں جو ۹۱ بچوں کی تربیت کی ذمہ دار ہیں۔ کچھ بچے پرائیویٹ سکولوں میں جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں دو کالج بھی ہیں۔

بلدیہ میں نظم و نسق کے لئے ذمہ دار ۳۲۸ افراد ہیں۔ کوڑا کرکٹ ہٹانے، ٹھنڈا اور گرم پانی مہیا کرنے پر ۴۸ افراد مامور ہیں۔ صفائی اور باغبانی پر ۱۳۵، فنی شعبوں سے متعلق ۹۸، ثقافت اور عوام کو بروقت معلومات بہم پہنچانے پر ۱۵۸، قومی سکولوں سے وابستہ ۴۹۶، بچوں کے مختلف انسٹی ٹیوٹس میں مامور ۸۲۷ اور دیگر سب ملا کر ۲۴۹۴ افراد بلدیہ کی مشینری کے کل پرزے ہیں۔ نظم و نسق پر ۱۳ فی صد خرچ ہوتا ہے۔

انتخاب کے ذریعے جو کونسلر بلدیہ میں پہنچتے ہیں ان کو مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اتفاق رائے سے بلدیہ کے امور پر فیصلے کرتے ہیں۔ مختلف شعبوں کے لئے ۸ کمیٹیاں ہیں ــــ لیکن ہمیں ان خاص اداروں کی تلاش ہے جو نظامِ ربوبیت کو سرگرمِ عمل رکھتے ہیں۔ ان میں پہلا ادارہ مرکزی سول رجسٹر ہے۔ یہ ادارہ ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں سے سلطنت کے ہر فرد کو سول رجسٹر نمبر جاری ہوتا ہے جسے یہاں CPR ــ NO. کہا جاتا ہے۔ اس فرد کی تاریخِ پیدائش یعنی دن، مہینہ اور سال اور رجسٹر نمبر ــ فرد کا نام اور پتہ، بلدیہ کا نام اور پتہ ہوتا ہے۔ اس سی پی آر نمبر کے بغیر نہ تو کوئی شخص رہائش حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی روزگار۔ بالکل ہی تہی دست ہوتا ہے۔ دوسرا ادارہ بیت المال (ٹیکس آفس) ہے جس کی طرف ہر بالغ فرد (مرد۔ عورت) کو ٹیکس کارڈ جاری کیا جاتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں روزگار تو مل سکتا ہے لیکن زیادہ عرصہ کے لئے نہیں اور محنت کی کمائی کا آدھا حصہ ٹیکس لے جاتا ہے تاوقتیکہ کارڈ پیش کیا جائے اور پھر زائد کٹوتی واپس مل جاتی ہے۔ کام کرنے والے ہر فرد کے ٹیکس کارڈ پر اس کا سی پی آر نمبر اور محنت کے ماحصل پر چھوٹ کی شرح ہوتی ہے۔ ایک دن کی چھوٹ ــ ہفتہ کی چھوٹ ــ ۱۴ دن کی چھوٹ۔ ایک ماہ کی چھوٹ۔ اس کے بعد زائد از ضرورت پر ۵۱ فیصد ٹیکس، دوسرے الفاظ میں بیت المال کا حصہ ــ مثلاً ایک شخص کے مہینے بھر کی محنت کا معاوضہ -/۱۵۰۰۰ ہے اور اس کی ماہانہ چھوٹ -/۳۷۵۰۱ ہے، -/۱۵۰۰۱ میں سے -/۳۷۵۰ منفی کر کے باقی پر ۵۱ فیصد ٹیکس ہے، تو -/۹۳۱۳ میں سے یونین کا ماہانہ چندہ -/۷۰۰، اگر ہے تو -/۸۶۱۳ کرونر اس فرد کے بنک میں پہنچ جائیں گے۔ یہاں یوں ہی ہوتا ہے۔ ۵۱ فیصد ادا کرنے کے بعد ہر قسم کی خریداری پر ۲۵ فیصد MOMS ادا ہوتا ہے۔ MOMS ویلیو ایڈڈ ٹیکس کو کہتے ہیں۔ تمام صنعتی ادارے، تاجر اور زراعت باقاعدہ سول رجسٹر پر درج ہوتے ہیں۔ لہٰذا بیت المال کہیں بھی

ضائع نہیں ہو سکتا کیونکہ ٹیکس اور VAT پر مامور افراد کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

۵۱ فی صد میں سے ۲۲ فی صد مرکز کو چلا جاتا ہے، ۱.۱۰ فی صد ضلعی بلدیہ کا حصہ ہے جس کے تحت ہسپتال، یونیورسٹی، کالج اور متفرق فنی تعلیم و تربیت کے سکول ہیں۔ ۰.۵۲ فیصد گرجا کے لئے ہر فرد ادا کرتا ہے ماسوا مسلمانوں کے اور ۱۹.۹ فی صد البرٹ سلنڈ بلدیہ پاس بچتا ہے۔ تمام افراد ہر سال ٹیکس کا گوشوارہ پُر کرتے ہیں اور تب ان گوشواروں کی جہت سے ٹیکس آفس تمام افراد سے وصولی کے حساب کتاب کے بعد لین دین کرتا ہے۔ اگر فرد کا حق نکلتا ہے تو پوری رقم کا چیک جاری ہو جاتا اور اگر فرد کے ذمہ کچھ نکلتا ہے تو اس سے قسطوں میں وصول کیا جاتا ہے۔

بچپن میں ایک حدیث سُنا کرتے تھے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی مزدوری ادا کرو۔ اس کو عملی صورت میں یہاں دیکھا۔ ہمارے وطن میں مزدور کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوتا رہے گا ۔۔۔ اس میں بہتری کے امکانات اوّل تو نظر نہیں آتے اور اگر بالفرض دعوٰے اٹھے کہ صورتِ حال بہتر ہو رہی ہے تو یہ منافقانہ جواب ہے کیونکہ جو لوگ تکذیبِ دین کے ہر لمحہ مرتکب ہو رہے ہوں وہاں کے حالات اسفل السافلین کی زد پر ہوتے ہیں ۔۔۔ یہاں پر چند گھنٹے ہی کام کیا ہو اور وہ بھی ناقص، پھر بھی چند گھنٹوں کی محنت کا ماحصل اس فرد کے بنک میں پہنچ جائے گا۔ یہاں بے ساختہ ایک واقعہ یاد آگیا جو میں نے عمر کے کسی حصہ میں پڑھا تھا۔ ایک سیلانی طبیعت کا شخص ایک گلہ بان کے پاس کام کی غرض سے پہنچا اور کمزوری بتائی ۔۔۔ اس گلہ بان نے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے حوالے کر دیا، شام کو ریوڑ باڑے میں چھوڑ کر وہ شخص کہیں اور چلا گیا۔ اتفاق سے اس ریوڑ میں ایک بھیڑ نے دو بچے دیئے تو گلہ بان نے ایک بچہ اس شخص کی اُجرت کے طور پر علیحدہ کر دیا، اتفاق سے وہ بچہ مادہ نکلی۔ چند برس کے بعد وہی سیلانی شخص اس گلہ بان کے پاس آیا اور ملتجی انداز میں اس سے کہا کہ اس کا ایک دن کا معاوضہ اس پر واجب ہے تو گلہ بان نے ایک چھوٹے سے ریوڑ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ رہی تمہاری اُجرت۔ سیلانی شخص نے کہا کہ نہیں! میں تو صرف ایک دن کی اُجرت کا حق دار ہوں۔ گلہ بان نے ساری بات بتائی تو اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔

فرد کی کمائی سے زاید از ضرورت کو بیت المال میں پہنچانے کا احسن انداز تو اختیار کر لیا مگر معاشرے کے دیگر امور پر وصولی، ادائیگی کو اعتماد اور بھروسے پر نہیں چھوڑا جا سکتا جس سے محض فسق و فجور ہی جنم لیتا ہے۔ لہٰذا ان تمام امور کے لئے تحقیقات کے ذریعہ ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ نہ کوئی رابن ہڈ رہا اور نہ ہی شیرِ نانشگھم۔ گو کہ متعدد بنک موجود ہیں مگر ان کا وجود محض منافع کے لئے ہوتا ہے اور یہاں غبن آسانی سے راہ پا سکتا ہے۔ اس لئے محفوظ ترین طریقہ ڈاک خانہ ہی نظر آیا تو ڈاک خانہ نے حکومت کی سرپرستی میں مرکزی جیرو (GIRO) بنک قائم کیا اور عوام، جو وصولی اور ادائیگی میں خلل کی بنا پر مشکلات میں گھرے ہوئے تھے، کو دعوتِ فکر دی گئی کہ مرکزی جیرو بنک سے رابطہ قائم کریں، ممکن ہے ہمارے پاس آپ کی مشکلات کا حل ہو۔ اس طرح لوگوں نے مرکزی جیرو بنک میں ادائیگی اور وصولی کے کھاتے کھول دیئے اور تب

جیرو بنک نے ادائیگی اور وصولی کے لئے ایسے کارڈ جاری کئے جن پر رقم وصول کرنے والے کا کھاتہ نمبر، اس کا نام اور ایڈریس، رقم واجب الادا اور ادا کرنے کی آخری تاریخ ہوتی ہے۔ اب ادائیگی کرنے والا اپنا جیرو کھاتہ نمبر اور دستخط کر کے ڈاک خانہ کو روانہ کر دیتا ہے، باقی کام جیرو بنک کرتا ہے۔ اور لطف کی یہ بات ہے کہ یہ تمام کام بلا مزدو معاوضہ ہے۔

تیسرے نمبر پر صحت اور معاشرتی تحفظ کا ادارہ ہے۔ یہ ادارہ کمیونٹی کی صحت اور معاشرتی زندگی کو توازن میں رکھنے کے لئے بیت المال میں پہنچنے والے ایک کراؤن کا ۲۷ فی صد خرچ کرتا ہے۔ اس ادارے میں شعبۂ صحت، شعبۂ پنشن، رہائش کے لئے مدد کرنے کا شعبہ، بیماری کے دوران الاؤنس کا شعبہ، ڈاکٹروں، نرسوں اور دیلفیئر سوشل ورکروں کا شعبہ، ضعیف العمر افراد کی دیکھ بھال کا شعبہ، ان افراد کی دیکھ بھال پر مامور افراد میں تحمل اور دیانت جیسے امتیازات کا ہونا شرط ہے۔ یہیں سے زچہ اور بچہ کی دیکھ بھال کے لئے نرس تعینات کر دی جاتی ہے جو بچہ کی پیدائش کے کافی عرصہ بعد تک ان سے وابستہ رہتی ہے۔ بچہ کی پیدائش پر جلد از جلد مذہبی امور سے متعلق منسٹر کے پاس اس کا اندراج کرانا ہوتا ہے۔ جہاں سے اس بچہ کا نام اور تاریخِ پیدائش شہری رجسٹر کے دفتر پہنچ جاتا ہے اور وہ بچہ معاشرے کا جزو قرار پا جاتا ہے۔ وہ معاشرے کے لئے اور معاشرہ اس کے لئے۔ یعنی ہیئتِ اجتماعیہ میں ایک قطرۂ نیساں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی تصور پر فرمایا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں

ضعیف العمر اور اپاہج افراد جو اپنے گھروں میں اپنے انتظامات مکمل نہیں کر پاتے ان کی مدد کا بندوبست کیا جاتا ہے کیونکہ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ:

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔"

(ترمذی، باب الفرائض)

اس معاشرے میں کسی نے بنک سے قرض لے رکھا ہو (جو عموماً ہوتا ہے) اور وہ وفات پا جائے تو اس کا قرض کالعدم ہو جاتا ہے۔ حضورؐ نے اس حالت کے لئے بھی فرمایا کہ:

"میں مسلمانوں سے ان کے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں، سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔" (ابو عبید، کتاب الاموال)

اگر کوئی فرد کسی وجہ سے بے روزگار ہو جائے، تو اس کی اقتصادی حالت کی ذمہ داری اس کی متعلقہ یونین پر ہو جاتی ہے۔ لیکن اس یونین کی ایک شرط ہے کہ فرد اس یونین کا کم از کم ایک سال سے رکن ہو اور وہ بھی روزگار کی موجودگی میں اور اگر وہ فرد اس شرط کو پورا نہ کرتا ہو تو یہ معاشرتی تحفظ کا ادارہ حرکت میں آجاتا ہے۔ یہ ادارہ فرد کو یونین کی شرط

پوری کرنے کے لئے روزگار مہیا کرتا ہے اور تب بے روزگاری الاؤنس شروع ہو جاتا ہے جو ۲½ سال تک جاری رہتا ہے اور پھر یونین، ایمپلائمنٹ ایکسچینج اور بلدیہ کے اشتراک سے اس فرد کو ۷ ماہ کے لئے روزگار مہیا کیا جاتا ہے جو دو مرتبہ دہرایا جاتا ہے اور پھر بھی فرد خود روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہے تو معاشرتی تحفظ کے ادارے کی ذمہ داری بن جاتا ہے۔ یہاں کے معیارِ زندگی کے مطابق ہر فیملی کی کم سے کم ۱۴۰۰۰/- کی آمدنی ماہانہ ہونی چاہیئے کیونکہ صرف مکان کا کرایہ ہی کم سے کم ۴۵۰۰/- ہے۔ اس سے آمدنی اگر کم ہو تو کرائے میں مدد مل سکتی ہے۔

جس طرح انسان کے پاس صرف ۲۴ گھنٹوں کا وقت ہے جو بار بار خود کو دہراتا رہتا ہے، اس میں نہ کمی ہوتی ہے نہ بیشی۔ اسی طرح قوموں کے پاس مخصوص دولت ہوتی ہے جس میں افرادی قوت نہایت اہم ہے۔ یہ دولت صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتی آرہی ہے۔ ۲۴ گھنٹوں میں تو توازن ہی توازن ہے اور غیر متبدل بھی مگر جیار بلی کے وجود کی بنا پر اس نسل در نسل منتقل ہونے والی دولت میں توازن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ خصوصی ادارے اس میں توازن برقرار رکھنے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

اس قوم کا بلند بانگ دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں صد فی صد خواندگی ہے۔ خواندگی کے لئے مکتبوں اور مدرسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بلدیہ میں اس وقت ۷ سکول ہیں۔ ان میں ۱۵ کنڈر گارڈن کی کلاسیں ہیں جن میں ۲۸۶ بچوں کی تربیت کا انتظام ہے۔ ہر کلاس میں بچوں کی تربیت پر معمور اعلیٰ صلاحیت، بردبار، حوصلے اور تحمل کی حامل دو معلمہ ہوتی ہیں جو ان نونہالوں کی بنیادوں کو اس قدر پختہ کر دیتی ہیں کہ یہ نونہال سکول کی ساری تعلیم و تدریس کو کھیل کود میں مکمل کر لیتا ہے۔

ان معلمین کو راز کی بات یہ بتائی جاتی ہے کہ کنڈر گارڈن ایک OCEAN ہے اس کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا اور نہ کبھی اس کی طرف پشت کرنی ہے ــــ جونہی کہیں جدت پیدا ہوتی ہے، یہاں فوراً غور و فکر شروع ہو جاتا ہے۔ مفید ثابت ہونے پر متعلقہ معلمین کو باری باری ریفریشر کورسوں پر ہفتہ دو ہفتہ کے لئے روانہ کر دیا جاتا ہے۔ سکولوں پر ۲۱ فی صد رقم صرف ہوتی ہے۔

یہاں سکولوں میں ہر جماعت کا سہ ماہی ٹیسٹ ہوتا ہے اور نتائج سے والدین کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ سکولوں میں والدین پر مبنی کمیٹیاں ہوتی ہیں اور گاہے بگاہے والدین کو بچے کی پراگرس کے لئے میٹنگ پر بلایا بھی جاتا ہے۔ جون میں سالانہ امتحانات ہوتے ہیں۔ نویں اور دسویں کے بچوں کو سرٹیفکیٹ ملتے ہیں اور اگست کے وسط تک چھٹیاں ہو جاتی ہیں اور بچے ذہنی طور پر آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہاں سکولوں میں کسی بچے کو فیل نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس فعل قبیح کا کوئی تصور ہی موجود ہے۔ اگست میں ہر بچہ اگلی کلاس میں چلا جاتا ہے۔ سکولوں میں کتابیں کاپیاں بلدیہ کی ذمہ داری ہے ــــ دورانِ تعلیم بچوں کو تولنا شروع کر دیا جاتا ہے اور جس کا پلڑا ورنی ہوتا ہے اس کی رپورٹ اس کے لئے باعثِ افتخار بنتی جاتی ہے۔ یہاں دو قسم کے کالج ہیں ایک تین سال کے لئے، اس کو GYMNASIA کہتے ہیں، اس میں بچہ نویں کے

بعد داخلہ لے سکتا' دوسرے کو HF کہتے ہیں اس میں دسویں کے بعد داخلہ ملتا ہے اور یہ دو سال کا ہے۔ اس کے علاوہ سکول آف اکنامکس ہے اور فنی ادارے بھی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ کو محیط کرنے کا پورا پورا بندوبست ہے۔ ۱۸ سال سے کم عمر بچوں کو ان کی کوتاہیوں کے عوض فیل کرنا معاشرے کے نزدیک نوخیز ذہنوں کو جمود کا شکار کرنے کے مترادف ہے اور وہ وقتی ناکامی سے مایوس ہو کر ہمت ہار دیتے ہیں اور اس طرح بزدلی ان میں راہ کر لیتی ہے۔ یہ فعل اساتذہ معلمین اور معاشرہ کی توہین کے مرادف ہے۔ ۱۶ سال کی عمر سے ۱۸ سال تک کا نوعمر بلوغت کی پُرکیف وادیوں سے گذر رہا ہوتا ہے اس لئے اس رنگین مرحلہ پر لوگ حد سے زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ اگر اس عمر کا کوئی بچہ چوری جیسے فعل کا مرتکب ہو جائے تو والدین کو شکایتاً انتباہ کر دیا جاتا ہے۔ ۱۸ سال سے نوعمر بالغ ہو جاتا ہے اور خود مختار فیصلوں کا مجاز و مختار۔

یہ قوم صدفی صد خواندہ ہونے کی جہت سے معاشی معاملات میں سربلند ہے' اس کے شعور کی پرواز اوج ثریا پر ہے جبکہ اس کے پاؤں زمین پر پیوست ہیں۔ احترام آدمیت' تحمل اور بردباری میں ملکہ حاصل ہے۔ قوم کا ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق معاشرے کے کام سرانجام دینے میں نہ تو عار محسوس کرتا ہے اور نہ ہی ہچکچاہٹ۔ یہاں کے اربابِ دانش و بینش کو اس بات کا تلخ تجربہ ہے کہ پیشہ غرور اور نخوست کی جڑ ہے اور ملک کو صاف ستھرا رکھنے والے ملکین کہلاتے ہیں اس لئے صفائی سے متعلق تمام کاموں کی اُجرت معقول سے بھی زیادہ مقرر ہے۔ سکولوں' سرکاری' نیم سرکاری اور تجارتی و صنعتی اداروں میں صفائی کے لئے کل وقتی عملہ ہوتا ہے۔ گھر کا کوڑا' مہیا کی گئی الماری میں' پلاسٹک کے بیگ میں بند کر کے رکھنا ہوتا ہے جسے ہفتہ میں ایک دفعہ بلدیہ کی گاڑی لے جا کر جلا دیا جاتا ہے۔ گھر' دکان کے سامنے سے سردیوں میں برف خود صاف کرنی ہوتی ہے۔ مبادا کوئی راہ گیر پاڈا کیہ پھسل جائے۔ چوٹ کی صورت میں گھر یا دکان والا خرچہ ادا کرے گا۔

سیوریج کا اخراج نہ تو کسی نالے میں ہوتا ہے نہ ہی کسی دریا میں یا سمندر میں بلکہ یہ اخراج اسی مقصد کے لئے تعمیر کردہ فیکٹریوں میں ہوتا ہے جہاں اس تمام کو ایک پراسیس سے گذار کر فضلہ اور پانی علیحدہ کر کے پانی کو ٹیسٹ کیا جاتا ہے' قابلِ استعمال ثابت ہونے پر سمندر میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح سمندر اور اس کے کنارے صاف رہتے ہیں اور آبی جانور اور مچھلی سب محفوظ رہتے ہیں۔ غلاظت اور گندگی' پراگندہ ذہن کی غفلت کا نتیجہ ہوتی ہے ـــــ ہمارے وطن کے قریہ قریہ میں صفائی آدھا ایمان ہے' کے رنگین اور چمکدار اعلانات آویزاں نظر آتے ہیں ـــــ ان اعلانات کے عین نیچے گندگی اور غلاظت کے ڈھیر ان اعلانات کی عملی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ وطن کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی گندگی قوم کے شعور کی گراوٹ ظاہر کر رہی ہے اور سیوریج دریاؤں میں چھوڑ دی جاتی ہے اور گلیوں میں گڑھے کھود کر غائب کر دی جاتی ہے جس سے پینے کا پانی زہرِ آب بنتا جا رہا ہے۔

علامہ اقبالؒ ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے تھے۔ وہاں انہوں نے صاف ستھری پختہ سڑکیں' پختہ گلیاں' سرسبز راستے اور پھل دار درختوں کے باغات دیکھ کر فرمایا تھا کہ:

جنت ہے جو تیری وہ کسی نے نہیں دیکھی
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

علامہ کے پاس نہ تو حکومت تھی اور نہ ہی دولت ـــــ وہ تو حقیقت میں ایک درویش منش تھے، ان کا دل یہی چاہتا تھا کہ مشرق میں بھی ایسی ہی جنتِ ارضی کے نمونے نظر آئیں ـــــ علامہ اس علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے متعلق ایک مغل شہنشاہ بے ساختہ پکار اُٹھا تھا:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است ـــــ ہمی است ہمی است

اس شہنشاہ کے پاس قوت و دولت موجود تھی جس کو وہ اپنی شہنشاہیت کی بقا کے لئے استعمال کرتا تھا مگر مسلمان ہونے کے باوجود نظامِ ربوبیت کے نفاذ کے لئے سوچا تک بھی نہ تھا۔ اور علامہؒ نے از رُوئے قرآن امتِ مُسلمہ کو طریقہ بتا دیا کہ جنت کیسے حاصل ہو سکتی ہے:

جنت تیری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

البرٹ سلنڈ بلدیہ راستوں، گلیوں، سڑکوں، کیاریوں، گھاس کے میدان، نشانِ راہ، پودوں، پھل دار درختوں اور صفائی پر چھ فی صد خرچ کرتی ہے۔ ۷½ بجے صبح عملہ کے لوگ اپنے اپنے علاقوں میں پھیل جاتے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ گاڑیاں اور سائیکلیں صرف اوقاتِ کار میں کام کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ کوئی انچارج بالالفاظِ دیگر کوئی آفیسر سرکاری گاڑی ذاتی کام کے لئے استعمال نہیں کر سکتا اور نہ ہی عملہ کے کسی آدمی کو اپنے گھریلو کاموں کے متعلق کہہ سکتا ہے بلکہ ایسا کرنے کے لئے سوچنا بھی اس کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔ ہر بلدیہ کا فاصلہ تین کلومیٹر ہے۔ سڑکیں دو رویہ اور بے داغ، راستے پختہ اور روشن، گلیاں پختہ اور روشن، سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں کے لئے پختہ اور روشن سڑکیں اور پٹڑیاں، دھول، خاک، کیچڑ، مٹی کا نام و نشان تک نہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔

ٹرانسپورٹ کی سہولت کا یہ عالم ہے کہ قریہ قریہ میں ریل اور بسوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ کوپن ہیگن کے مرکزی سٹیشن سے ۲۴ گھنٹوں میں لوکل، انٹر سٹی اور یورپ کے لئے ۶۰۰ ٹرینیں گزرتی ہیں۔ تمام شہروں اور گاؤں کی بسیں سٹیشن سے منسلک ہیں۔ وقت کی پابندی کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو سارا سلسلہ تہس نہس ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر چیز سائیکل میں رواں دواں ہے پانی کے دھارے کی طرح جو مستقل حرکت میں ہے۔ ہوائی مستقر ہو یا سمندری بندرگاہ، وہاں پہنچنا اور وہاں سے شہر آنا کوئی دشوار نہیں۔

اس بلدیہ میں دو لائبریریاں ہیں جہاں بیشتر زبانوں کے اخبار میسر اور دنیا کی متعدد کتب موجود ہیں۔ ہر شخص جتنی کتابیں

چاہے، ایک ماہ کے لئے مستعار لے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ موسیقی کے ریکارڈ اور ٹیپس بھی ہر ایک کی ضرورت کے لئے موجود ہیں۔ لائبریری کے انتظامات، کتب اور دیگر سہولتیں پر بیت المال کا ۵ فی صد خرچ ہوتا ہے۔ ثقافتی تقریبات بھی اس شرح میں شامل ہیں۔

ہر سال تمام اخراجات کی رپورٹ بلدیہ کے شہریوں کے گھر پہنچ جاتی ہے، اس میں افراد کی محنت کے عزیز ترین ماحصل کی ایک ایک پائی کا حساب ہوتا ہے۔ نہ کوئی گھپلا اور نہ کوئی غبن۔ دوسرے کی ضرورت مقدم۔ باقی ۴ فی صد سود کی رقوم میں توازن برقرار رکھنے اور فراغت کے مشغلوں پر صرف ہوتا ہے۔

اس قوم نے فکرِ معاش جیسے عفریت کو مسخر کر کے روح کو آزاد تو کرا لیا لیکن ابھی انسان کی EGO مکمل خود مختار نہیں۔ یہ تو حقیقت ہے کہ انفرادی خیرات و صدقات انسانی انا کو سوخت کر دیتی ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ صدقات و خیرات انسان کے قلب کی موت ہیں۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ کسی کا اپنی پشت پر بوجھ لادنا بہتر ہے اس سے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے۔" (بخاری، کتاب الزکوٰۃ)

ڈنمارک میں انفرادی طور پر کسی طرح سے بھی خیرات و صدقات مانگنا، لینا یا اکٹھی کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ لیکن اس کے بغیر گلشن کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ احترامِ آدمیت کو برقرار رکھتے ہوئے امدادی انجمنیں تشکیل دی گئیں۔ ان کو حکومت سے منظور کرایا گیا اور جیرو کھاتہ حاصل کیا گیا جو حکومت کی طرف سے ہر لمحہ چیک ہونے کے کھلا رہتا ہے۔ ان انجمنوں میں کینسر ریسرچ، اندھوں اور بیرونِ ملک یتیم، لاچار اور اپاہج بچوں کی انجمنیں ہیں۔ ہر ماہ یہ لوگ اپنی ماہانہ ادائیگی میں ان انجمنوں کی طرف سے ہر گھر میں بھیجے گئے جیرو کارڈ بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس طرح دینے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کو دے رہا ہے اور لینے والے کو کہ کس نے دیا ہے۔ جب کوئی اندھا کتے کے سہارے بازار گھوم رہا ہوتا ہے یا ٹرین پر سوار ہو رہا ہوتا ہے تو لوگ اس انجمن کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ معاشی اور معاشرتی تحفظ صرف نظامِ ربوبیت ہی بہم پہنچا سکتا ہے کہ افرادِ امت کا پیٹ بھرا ہوا، ذہن ہشاش بشاش، چہرہ بشاش اور صورت پر مسکراہٹ بکھری ہوئی رہتی ہے۔ نظام کے تحفظ سے مصائب و آلام کا کوئی احتمال نہیں رہتا جہاں کوئی حیوان، جانور اور پرند چرند بھوکا نہیں رہ سکتا۔

نظامِ ربوبیت کی موجودگی میں مذہب کے پنپنے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ قوم و ملک پر ایک ہی وقت میں دو امام نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مذہب کا جتنا بھی حصہ باقی ہے وہ نظامِ ربوبیت کی سرپرستی میں ہے۔ بلدیہ افراد کی محنت کے ماحصل سے ۰.۵۲ فی صد چرچ کے نام سے وصول کرتی ہے۔ اس سے چرچ کی تعمیر اس کی مرمت اور پادری کی رہائش اور تنخواہ بلدیہ ادا کرتی ہے۔ کسی فرد، انجمن یا جماعت کو کوئی اختیار و اجازت نہیں کہ چرچ کے سلسلہ میں چندہ یا خیرات اکٹھی کرتا پھرے۔ لوگوں کے عقیدے کے احترام کے لئے پیدائش سرٹیفکیٹ کے اجرا اور موت کی رجسٹریشن کے حقوق پادری کو دے

رکھے ہیں۔ ویسے بھی اس کے پاس کوئی کام ہے ہی نہیں۔ یہاں مذہب کی کوئی آزاد حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ایسی کوئی خواہش ہی ہے۔

نئے سال کے پہلے گجر پر جب پوری قوم آتش بازی سے نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہی ہوتی ہے اس وقت ٹیلی ویژن پر یہ دُعا دکھائی جا رہی ہوتی ہے:

اے ربِ کائنات! ہم تیرا شکریہ کن الفاظ میں ادا کریں کہ تو نے ہمیں ایک چھوٹی سی خوبصورت آزاد اور خود مختار سلطنت سے نوازا ہے جس میں کوئی فرد بھوکا نہیں ہوتا.....

یہ سب کچھ مطالعہ سے بے شک تعلق رکھتا ہے لیکن مشاہدے کے بغیر مطالعہ محض کلرکی ہے۔ ہمارے سفارتکاروں کا یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ جہاں انسان کی منفعت کے اصول یا انداز عملی صورت میں دیکھیں ان کا خاکہ ملک روانہ کریں۔ مگر یہ کلرک نہیں کر سکتا' اس کے لئے فیلڈ مین کی ضرورت ہے!!!

نگاہیں جن کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
انہیں ماضی کی بے رحمی کو دہرانا نہیں آتا

ماخذ

مفہوم القرآن علامہ پرویزؒ	نظامِ ربوبیت علامہ پرویزؒ	روحِ اقبال ڈاکٹر یوسف حسین خاں	شاہکارِ رسالت علامہ پرویزؒ	فکرِ اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

گردہ برائے فروخت

غربت، بے روزگاری، بھوک اور قرض کی وجہ سے ایک شخص اپنا گردہ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ خون گروپ بی پازیٹو ہے۔

رابطہ: معرفت پوسٹ بکس نمبر ۳۴۹۱، کراچی ۷۴۸۰۰

عبداللہ خالد خان - لالہ موسیٰ

نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن....!

علامہ اقبالؒ نے برطانوی سامراج کے عہدِ غلبہ میں اہلِ ہند کو بالعموم اور مسلم عوام کو بالخصوص حرکت و عمل اور جدوجہد کا درس دیا۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو غلامی کے طوق و سلاسل توڑ کر آزادی کے لئے ستیزکاری پر مائل کیا۔ ان کے کلام میں زندگی کے جمود زدہ سکونی نظریئے کی نفی اور حرکی تصورِ حیات کی ستائش کا درس ملتا ہے۔ مسلمانوں کی بدحالی اور خانماں خرابی دیکھ کر وہ بے پایاں کرب محسوس کرتے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں نے فکر و نظر کے چراغ گل کر کے تقلیدِ ماضی اور معقولات کی بجائے منقولات کو ہی علم و فن کا درجہ دے دیا ہے۔ مسلمانوں میں عصری علوم و فنون کی تحصیل کا شوق و جذبہ ہی عنقا ہو رہا تھا۔ اسی لئے اپنی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" میں کہتے ہیں۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

علامہ اقبالؒ کے پُراثر اشعار اور کیف بار نغمات رنگ لائے اور برصغیر کے خارزارِ غلامی میں آزادی کے گیت گونج اُٹھے، حصولِ آزادی کی جدوجہد تیز ہو گئی۔ مسلم عوام کو خوش بختی سے قافلہ سالار بھی قوی اور امین، اپنے اصولوں پر چٹان کی طرح ڈٹ جانے والا قائداعظمؒ مل گیا۔ شاید اسی قافلہ سالار کے کردار و عمل سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے دورِ غلامی کے یاس انگیز صبح و شام میں یہ شعر کہا تھا۔

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

اور یہ حقیقت ہے کہ برصغیر کے مقہور اور بے بس ناتواں مسلم عوام کے لئے قائداعظمؒ شعاعِ امید کا درجہ رکھتے تھے۔ جس وقت قائداعظمؒ حصولِ آزادی کے لئے جہد آزما ہوئے اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کی حالت زار کس قدر دگرگوں تھی، قائداعظمؒ ہی کے بقول سنیئے :۔

"گذشتہ دو صدیوں سے مسلم ہندوستان کی کیفیت، اس جہاز کی سی چلی آرہی تھی جس کے پتوار نہ ہوں اس کا کوئی ناخدا نہ ہو اور چٹانوں سے بھرپور سمندر میں ہچکولے کھا رہا ہو۔ دو سو سال سے وہ شکستگی، بدنظمی اور ابتری کے عالم میں برابر سطحِ آب پر تیرتا چلا آرہا ہے۔"

(۲۵ دسمبر ۴۲ء)

قائداعظمؒ اسی شکستہ کشتی کو ساحلِ امید پر لانے کے لئے جدّوجہد کر رہے ہیں۔ وہ بیک وقت برطانوی سامراج اور ہندو راج قائم کرنے کے خواہش مند برہمن سامراج سے سرگرم ستیز تھے۔ آزادی کی اس تحریک کو قدم قدم پر سبوتاژ کرنے کے لئے برہمن سامراج نے بعض بے بصر مذہبی ملاؤں کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کیا مگر مسلمان اپنے قائد کی فراست سے اس دامِ ہمرنگ زمیں سے بچ کر ترغیب و تحریص کی ہر کوشش کو حقارت سے ٹھکرا کر اپنی منزل کی جانب گامزن رہے۔ ہندو راج کی راہ ہموار کرنے والے کور چشم مذہبی راہنما اور برہمن سامراج دونوں مسلمانوں کی بیدار مغز قیادت سے شکست کھا گئے۔ مسلم عوام نے اپنے محبوب قائد کی زیرِ قیادت چل کر پاکستان حاصل کر لیا۔ آزاد پاکستان آگ اور خون کے پُرہول دریا عبور کر کے حاصل ہوا۔ اس ملک کی بنیادوں میں ان گنت شہیدوں کا مقدس لہو شامل ہے۔ اس آزاد وطن کو مثالی ریاست بنانے کی آرزو سے معمور قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

"مغرب کے معاشی نظام نے نوعِ انسانی کے لئے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے ہم اپنا نصب العین یعنی عوام کی مرفہ الحالی اور اطمینان کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا، ہمیں اپنا راستہ آپ تراشنا ہوگا۔"

(اسٹیٹ بنک، خطاب، یکم جولائی ۱۹۴۸ء)

تقلید کی بجائے اجتہاد، نقالی کے برعکس تخلیق کا درس دینے والے قافلہ سالار نے سرمایہ دارانہ معاشی نظام کو ہمیشہ ناپسند کیا، وہ مساوات، عدل اور سماجی انصاف کے عظیم داعی تھے۔ افسوس صد افسوس کہ تخلیقِ پاکستان کے فوری بعد ؎

گُل کو شکستِ رنگ کا پیغام آ گیا

قائداعظمؒ نوآزاد پاکستان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ پاکستان کو ان کی راہنمائی اور شفقت آمیز سرپرستی کی اشد ضرورت تھی۔ ان کی رحلت کے بعد زمامِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ آئی جو کسی صورت قائد کا نعم البدل نہ تھے۔ بساطِ سیاست پر ناگوار کھیل کھیلے گئے۔ پاکستان کے عوام انگشت بدنداں تھے کہ ہماری قربانیوں اور انتھک جدّوجہد کا حاصل یہ محلاتی سازشیں ہی تھیں؟ شاید زود فراموش عوام بھول ہی گئے تھے کہ ان طالع آزما سیاسی عناصر پر قائداعظمؒ تحریکِ آزادی کے دوران بھی کم ہی انحصار کرتے تھے۔ قائد نے فرمایا تھا:

"تم جانتے ہو تمہاری مسلم لیگ کیا ہے؟ ایک صدر، اس کا سٹینوگرافر اور ایک اٹیچی کیس"۔

(عربک کالج دہلی ۱۹۴۶ء)

تحریکِ پاکستان تو قائداعظمؒ کی تنہا قیادت اور عوام کی بھرپور جدوجہد کے نتیجے میں کامیاب ہوئی۔ طالع آزما عناصر تو "فتح مبین" کا پختہ یقین ہو جانے پر اس تحریک میں شامل ہوئے۔ انہیں عوام کی فوز و فلاح اور ملک کی سلامتی سے والہانہ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی دلچسپی تو مسلم عوام اور ان کے قائد کے دل میں تھی جو کہتے تھے:۔

"ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو کے تمام تقاضے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ہم ختم ہو کر رہ جائیں گے"۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء)

ایسی بات قائداعظمؒ ہی کہہ سکتے تھے جن کی خارہ شگافی کے نتیجے میں یہ ملک معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن ان کے بعد آنے والے سیاسی راہنماؤں نے اس آزادی کی نعمت کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ پاکستانی قوم کی تشکیل کے لئے جس فکری اور عملی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اس کے برعکس، اپنے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے کوشش کی گئی۔ اس سیاسی "انارکی" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نسلی، لسانی اور گروہی بنیادوں پر قائم تنظیموں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ایسی تنظیموں کو اکثر ایسے عناصر کی سرپرستی حاصل تھی جو تحریکِ پاکستان میں کانگریس نواز یا مخالف پاکستان کردار کے حامل تھے۔ ان شکست خوردہ عناصر نے پاکستان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کو ہوا دی۔ ایسی کوششوں کو سیاستدانوں کی ناعاقبت اندیشی اور طویل مارشل لاء حکومتوں نے بھی تقویت پہنچائی۔

جمہوری عمل کو سبوتاژ کر کے مارشل لاء لگانے والے جرنیلوں نے جہاں جمہوری اداروں کو تباہ کیا وہیں عوام کے بنیادی حقوق بھی معطل کئے۔ اس طرزِ عمل سے ایک احساسِ محرومی نے جنم لیا۔ اس بددلی کو شکست خوردہ عناصر اور اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند سیاسی راہنماؤں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ آج یہی نسلی، لسانی اور گروہی منافرت اپنے جوبن پر ہے۔ ملک میں جس قسم کی قومی وحدت چاہیئے وہ عنقا ہے۔ محبِ وطن حلقے قومی یک جہتی کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ مگر حکمران اور سیاسی راہنما اپنی انانیت کے گنبد میں بند صرف اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے پریشان کن حالات میں بانیٔ پاکستان کا فرمان ذہن میں آتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا:۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپے تخریب ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذبِ توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آجائیں"۔

(ڈھاکہ میں تقریر مارچ ۱۹۴۸ء)

"تم جانتے ہو تمہاری مسلم لیگ کیا ہے؟ ایک صدر، اس کا سٹینوگرافر اور ایک اٹیچی کیس"۔

(عربک کالج دہلی ۱۹۴۶ء)

تحریکِ پاکستان تو قائداعظمؒ کی تنہا قیادت اور عوام کی بھرپور جدوجہد کے نتیجے میں کامیاب ہوئی۔ طالع آزما عناصر تو "فتح مبین" کا پختہ یقین ہو جانے پر اس تحریک میں شامل ہوئے۔ انہیں عوام کی فوز و فلاح اور ملک کی سلامتی سے والہانہ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی دلچسپی تو مسلم عوام اور ان کے قائد کے دل میں تھی جو کہتے تھے:۔

"ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو کے تمام تقاضے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ہم ختم ہو کر رہ جائیں گے"۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء)

ایسی بات قائداعظمؒ ہی کہہ سکتے تھے جن کی خارہ شگافی کے نتیجے میں یہ ملک معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن ان کے بعد آنے والے سیاسی راہنماؤں نے اس آزادی کی نعمت کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ پاکستانی قوم کی تشکیل کے لئے جس فکری اور عملی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اس کے برعکس، اپنے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے کوشش کی گئی۔ اس سیاسی "انارکی" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نسلی، لسانی اور گروہی بنیادوں پر قائم تنظیموں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ایسی تنظیموں کو اکثر ایسے عناصر کی سرپرستی حاصل تھی جو تحریکِ پاکستان میں کانگریس نواز یا مخالف پاکستان کردار کے حامل تھے۔ ان شکست خوردہ عناصر نے پاکستان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کو ہوا دی۔ ایسی کوششوں کو سیاستدانوں کی ناعاقبت اندیشی اور طویل مارشل لاء حکومتوں نے بھی تقویت پہنچائی۔

جمہوری عمل کو سبوتاژ کر کے مارشل لاء لگانے والے جرنیلوں نے جہاں جمہوری اداروں کو تباہ کیا وہیں عوام کے بنیادی حقوق بھی معطل کئے۔ اس طرزِ عمل سے ایک احساسِ محرومی نے جنم لیا۔ اس بددلی کو شکست خوردہ عناصر اور اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند سیاسی راہنماؤں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ آج یہی نسلی، لسانی اور گروہی منافرت اپنے جوبن پر ہے۔ ملک میں جس قسم کی قومی وحدت چاہیئے وہ عنقا ہے۔ محبِ وطن حلقے قومی یک جہتی کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ مگر حکمران اور سیاسی راہنما اپنی انانیت کے گنبد میں بند صرف اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے پریشان کن حالات میں بانیٔ پاکستان کا فرمان ذہن میں آتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا:۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپے تخریب ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذبِ توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آجائیں"۔

(ڈھاکہ میں تقریر مارچ ۱۹۴۸ء)

"تم جانتے ہو تمہاری مسلم لیگ کیا ہے؟ ایک صدر، اس کا سٹینوگرافر اور ایک اٹیچی کیس"۔

(عربک کالج دہلی ۱۹۴۶ء)

تحریکِ پاکستان تو قائداعظمؒ کی تنہا قیادت اور عوام کی بھرپور جدوجہد کے نتیجے میں کامیاب ہوئی۔ طالع آزما عناصر تو "فتح مبین" کا پختہ یقین ہو جانے پر اس تحریک میں شامل ہوئے۔ انہیں عوام کی فوز و فلاح اور ملک کی سلامتی سے والہانہ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی دلچسپی تو مسلم عوام اور ان کے قائد کے دل میں تھی جو کہتے تھے:۔

"ہماری نجات، ہماری سلامتی اور عزت و آبرو کے تمام تقاضے پاکستان سے وابستہ ہیں۔ اگر ہم یہ جنگ ہار گئے تو ہم ختم ہو کر رہ جائیں گے"۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء)

ایسی بات قائداعظمؒ ہی کہہ سکتے تھے جن کی خارہ شگافی کے نتیجے میں یہ ملک معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن ان کے بعد آنے والے سیاسی راہنماؤں نے اس آزادی کی نعمت کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ پاکستانی قوم کی تشکیل کے لئے جس فکری اور عملی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اس کے برعکس، اپنے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے کوشش کی گئی۔ اس سیاسی "انارکی" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نسلی، لسانی اور گروہی بنیادوں پر قائم تنظیموں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ایسی تنظیموں کو اکثر ایسے عناصر کی سرپرستی حاصل تھی جو تحریکِ پاکستان میں کانگریس نواز یا مخالف پاکستان کردار کے حامل تھے۔ ان شکست خوردہ عناصر نے پاکستان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کو ہوا دی۔ ایسی کوششوں کو سیاستدانوں کی ناعاقبت اندیشی اور طویل مارشل لاء حکومتوں نے بھی تقویت پہنچائی۔

جمہوری عمل کو سبوتاژ کر کے مارشل لاء لگانے والے جرنیلوں نے جہاں جمہوری اداروں کو تباہ کیا وہیں عوام کے بنیادی حقوق بھی معطل کئے۔ اس طرزِ عمل سے ایک احساسِ محرومی نے جنم لیا۔ اس بددلی کو شکست خوردہ عناصر اور اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند سیاسی راہنماؤں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ آج یہی نسلی، لسانی اور گروہی منافرت اپنے جوبن پر ہے۔ ملک میں جس قسم کی قومی وحدت چاہیئے وہ عنقا ہے۔ محبِ وطن حلقے قومی یک جہتی کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ مگر حکمران اور سیاسی راہنما اپنی انانیت کے گنبد میں بند صرف اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے پریشان کن حالات میں بانیٔ پاکستان کا فرمان ذہن میں آتا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا:۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپے تخریب ہیں۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذبِ توجہ وعدوں کے فریب میں نہ آجائیں"۔

(ڈھاکہ میں تقریر مارچ ۱۹۴۸ء)

ان کے نالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ کئی دفعہ یہ نمبر انگیج ملتا ہے، پتہ چلتا ہے کہ امریکی صدر سے بات ہو رہی ہے، جاپانی وزیراعظم بات کر رہے ہیں، ہنود اور یہود کی سنی جا رہی ہے لیکن اگر رابطہ نہیں ہوتا تو مسلمانوں کا نہیں ہوتا۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

آخر کیا وجہ ہے کہ امتِ احمد مرسلؐ زبوں حال ہے اور اغیار پوری دنیا میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اپنی اس الجھن کا اظہار ایک عالمِ دین سے کیا، انہوں نے فرمایا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم سچے مسلمان نہیں رہے۔ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہماری زکوٰۃ سب دکھاوے کی حد تک ہے، ہم ان عبادات کی روح کو نظرانداز کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بھی پڑھا ؎

میں تو سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

لیکن مولانا کے اس جواب سے میری تسلی نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت جو قومیں عروج پر ہیں وہ سب کی سب غیر مسلم ہیں، چنانچہ وہ تو دکھاوے کی نماز بھی نہیں پڑھتیں۔ اسی طرح مسلمان ایک طویل عرصے تک قوموں کی امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں، اس میں صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کا دور ایسا ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ راعی اور رعایا دونوں اسلامی تعلیمات پر پوری طرح کاربند تھے جبکہ مسلمان تو صدیوں تک سُپر پاور رہے ہیں۔

اُموی، عباسی اور مغل فرمانرواؤں نے پوری دنیا کو آگے لگا رکھا تھا اور ان ادوار میں نہ راعی مثالی مسلمان تھے اور نہ رعایا بلکہ بعض مسلمان بادشاہ تو اتنے فاسق و فاجر گزرے ہیں۔ کہ ہم کوشش کے باوجود اتنے فاسق و فاجر نہیں ہو سکتے۔ تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ ہماری سنتا رہا ہے، آج نہیں سنتا، اس دور میں امتِ محمدؐ سربلند تھی آج سرنگوں ہے۔ سندھ میں ایک مسلمان دوشیزہ بے آبرو ہوتی تھی، تو محمد بن قاسم ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اس کے سر پر چادر رکھنے آتا تھا۔ آج کشمیر، بوسنیا اور فلسطین کی بیٹیاں چیخ چیخ کر ہمیں پکار رہی ہیں لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی کہ ہمیں اپنی پڑی

ہوئی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبوں حالی کا دَور ختم ہو اور ہم دوبارہ قوموں کی امامت کا فریضہ سنبھالیں، تو اس کے لئے ہمیں دل و دماغ کے دروازے کھول کر غور و فکر کرنا ہوگا۔ کلیشے قسم کے جوابات اس مسئلے کا حل نہیں ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اپنی آخرت سنوارنے اور دل کی دنیا آباد کرنے کے لئے عبادت کا وہ کورس لازمی ہے جو ہمیں اسلام نے بتایا ہے اور قوموں کی امامت سنبھالنے کے لئے ان مسلّمہ اصولوں کو اپنانا ضروری ہے جو مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں اپنا رکھے تھے اور یہ اصول مختلف قوموں کے لئے مختلف نہیں ہیں بلکہ سب کے لئے ایک ہی ہیں۔ یہ اصول مختلف قول و فعل میں ہم آہنگی، عدل، سچائی، ڈسپلن، اتحاد، ملکی قوانین کی پابندی، کشادہ دلی، تحمّل، برداشت اور آزادیٔ فکر وغیرہ سے عبارت ہیں۔ جن قوموں نے بھی ترقی کی ہے انہیں اصول کو اپنا کر، جو قومیں بھی قعرِ مذلت میں گری ہیں ان اصولوں سے روگردانی کے نتیجے میں گری ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو آسمان سے بھی گرا سکتا تھا لیکن اس نے تخلیق کا ایک نظام وضع کیا، بنے بنائے درخت بھی وجود میں آسکتے تھے لیکن اس نظام کو بھی ایک ضابطے کا پابند کیا، اسی طرح قوموں کی ترقی کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں اور جو قوم ان کی پیروی کرے گی، وہ اس دنیا میں فلاح پائے گی۔ روحانی فلاح کے لئے ایک علیحدہ ہے اور وہ اس اشتہار میں درج ہے جو میں نے کالم کے آغاز میں درج کیا ہے۔ اپنے دل میں دنیا آباد کرنے کے لئے اس پر عمل ضروری ہے لیکن اگر ہم نے اس دنیا میں کفار کا مقابلہ کرنا ہے تو ہمیں ٹیکنالوجی میں ترقی کرنا ہوگی، غور و فکر کرنا ہوگا، ریسرچ کرنا ہوگی، نظامِ عدل نافذ کرنا ہوگا اور قوم کو اتحاد، تنظیم اور یقین کی دولت سے مالا مال کرنا ہوگا اور ان میں سے کوئی چیز بھی خلافِ اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی منشا کے عین مطابق ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ہم اللہ تعالیٰ کا نمبر ڈائل کریں گے تو وہ یقیناً ہماری سنے گا بصورتِ دیگر یہ رابطہ ممکن نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کے لئے اپنے اصولوں سے روگردانی نہیں کرتا۔"

(نوائے وقت ۱۱ جنوری ۱۹۹۳ء)

قیدی کی بیوی

"آداب! میں اس سے قبل اس بارے میں انسانی حقوق کمیشن کے ایس ایم ظفر صاحب،

عاصمہ جہانگیر صاحبہ، شریعت کورٹ، وزیراعظم اور بیگم کلثوم نواز صاحبہ کو خطوط لکھ چکی ہوں۔ جناب ایس ایم ظفر صاحب نے میرے خط پر اپنے کالم میں لکھا بھی تھا۔ میں ایک ایسے حق کی بات کر رہی ہوں جس کے ذکر کی ہمارا معاشرہ اجازت نہیں دیتا۔ اسے حقیقت مان کر بھی اس کی بات کوئی نہیں کرتا۔ محترم! میں ایک ایسی عورت ہوں جس کا شوہر عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ میرا اس کے جرم میں کوئی حصہ نہیں مگر میں پھر بھی اس کی سزا کاٹ رہی ہوں اور میرے جیسی ہزاروں عورتیں ایسی ہی سزا کاٹ رہی ہیں۔ ہم اپنے ازدواجی حقوق سے محروم ہیں جس کی اجازت ہم کو ہمارا خدا، مذہب، معاشرہ سبھی دیتے ہیں لیکن ہمارا قانون اس میں رکاوٹ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ طلاق لے سکتی ہیں۔ لیکن کیا ہم اپنے شوہر سے وفا کی اس سزا کی قصوروار ہیں۔ ہمیں زمانے کی ہوس بھری نظروں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اتنے بڑے امتحان میں کیوں ڈالا جا رہا ہے۔ ہم اپنے خاوند کی اولاد سے کیوں محروم ہیں۔ ہم اس کا وارث کیوں پیدا نہیں کر سکتیں، صرف اس لئے کہ ہم بے نظیر نہیں ہیں۔ آخر وہ کس قانون کے تحت ایک بچی کی ماں بن گئی ہیں۔ اتنے مضبوط اعصاب والی عورت کیوں اپنے اوپر کنٹرول نہیں کر سکی۔ خدا کے نام پر ہماری اس فریاد کو اعلیٰ حکام تک پہنچائیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ ہم اپنے باپ بھائی سے کہیں، تو وہ ہمیں قتل کر ڈالیں۔ میں اس لئے کسی سے نہیں کہتی اور اپنا نام بھی نہیں لکھ رہی۔ آپ ہماری گونگی سچائی کو آواز دیں اور ہمیں ہمارا یہ جائز حق لے دیں۔ کتنی عورتیں برائی سے بچ سکتی ہیں اور کتنے گھر ٹوٹنے سے بچ سکتے ہیں اور کتنے لاوارثوں کو وارث مل سکتے ہیں؟

پاکستان کی ایک بے قصور بیٹی

(محقق)

پاکستان کے کھیت

"پاکستان میں ۴۰ ہزار گاؤں ہیں، ان میں ۴۲ لاکھ خاندان بستے ہیں، ۹۱ فیصد لوگوں کے پاس ۲۵ ایکڑ سے کم زمین ہے، ان سے ٹیکس لینا ظلم ہے لیکن ہزاروں ایکڑوں کے مالکوں کا ٹیکس سے انکار بھی ظلم ہے اور پاکستان کی معیشت کے لئے تباہ کن ہے۔ ۵۴ لاکھ ایکڑ زمین بنجر ہے مگر اس کی آبادکاری کی کوئی سکیم نہیں ہے۔" (جاوید علی بھٹی)

زنا کرنے اور سزا سے بچنے کے خوبصورت داؤ پیچ

"چور کی چوری، شرابی کی شراب نوشی اور زانی کی زناکاری پر اگر رپٹ بھی درج ہوگئی اور مقدمہ عدالت کے نوٹس میں بھی آگیا لیکن) اگر استغاثہ واردات سے ایک ماہ گزر جانے تک مجرم کے خلاف گواہ نہ پیش کر سکا (تو مقدمہ بھی ختم ہوگیا) اب نہ کسی مجرم کو گرفتار ہی کیا جا سکے گا اور نہ اُسے کسی سزا کا ہی مستحق سمجھا جائے گا (کیونکہ اب یہ مقدمہ زائد المیعاد ہو چکا ہے)"

(ہدایہ جلد ۲ باب الشہادۃ علی الزنا)

اس عبارت میں دراصل داؤ یہ پنہاں ہے کہ اگر کوئی چور، کوئی شرابی اور کوئی زانی گواہوں کو کچھ دے دلا کر یا اپنے ذاتی اثر سے ایک ماہ تک کہیں آگے پیچھے کر سکے (تو کر لے)۔ اس طرح وہ کھڑے کھڑے ہی بری ہے۔

زانی مرد نے اگرچہ چار بار اقرار کیا کہ میں نے اس عورت سے زنا کیا ہے لیکن عورت اگر یہ کہہ دے کہ اس شخص نے مجھ سے زنا نہیں بلکہ نکاح کیا ہے تو مرد سے زنا کی حد (سنگساری یا کوڑوں کی مار) ساقط ہو جائے گی۔

ہدایہ جلد ۲، باب الوطی الذی یوجب الحد عین الہدایہ ص ۴۶۲)

ایسے ہی عورت بھی اگرچہ چار بار کہے کہ اس مرد نے مجھ سے زنا کیا ہے لیکن مرد اگر کہے کہ میں نے اس عورت سے نکاح کیا ہے تو مرد سے زنا کی حد ساقط ہو جائے گی۔ (حوالہ مذکور)

- زانی اگر پکڑے جانے پر، یہ کہہ دے کہ یہ عورت میری بیوی ہے تو بس اتنے سے ہی زنا کی حد اس سے ساقط ہو جائے گی (اور مزید تحقیق نہیں کی جائے گی) حالانکہ وہ عورت درحقیقت اس کی بیوی نہیں تھی۔ (ہدایہ، جلد ۴، کتاب الحدود عین الہدایہ ص ۴۴۶)
- زانی کو سنگسار کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس کو سنگسار کرتے وقت پہلے گواہ پتھر ماریں پھر قاضی اور پھر دوسرے لوگ لیکن اگر گواہ اُسے پتھر مارنے سے انکار کر دیں تو اب اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔

اگر سنگسار کرنے کے وقت گواہ مر چکے ہوں یا (کسی سودے بازی کی وجہ سے) کھسک جائیں، تو زنا کی حد بھی ساقط ہو جائے گی۔ (عین الہدایہ صفحہ ۴۴۶ — ۴۴۷)

- اگر کوئی شخص اپنی محرمات (یعنی ماں، بہن، بیٹی، بھتیجی، بھانجی، پھوپھی، خالہ) میں سے کسی

سے نکاح کرلے اور ہم بستری بھی کرے، تو اس پر زنا کی حد جاری نہیں کی جائے گی، ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے۔ (عین الہدایہ، جلد ۲، ص ۴۵۷)

حد جاری نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اپنی محرمات سے ہم بستری زنا کی تعریف میں نہیں آتی کیونکہ زنا وہ ہے جو کسی غیر عورت سے کیا جائے محرمات سے ہم بستری زنا نہیں ہے۔

(عین الہدایہ، جلد ۲، باب الوطی الذی یوجب الحد ص ۴۵۴)

- اگر کوئی عورت کسی (قریب البلوغ) بچے کو بہلا پھسلا کر یا کسی بے وقوف (نوجوان) کو آلہ کار بنا کر اس سے زنا کرائے گی تو (خیر ہے) ان میں سے کسی پر بھی حد جاری نہیں کی جائے گی۔

(ہدایہ، جلد ۲، باب الوطی)

- زنا کی واردات ثابت ہے، چار گواہ بھی موجود ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم صرف اس (شریف) آدمی (زانی) کو ہی پہچانتے ہیں زانیہ کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ کون تھی۔ ایسی صورت میں بھی زانی سے حد ساقط ہو جائے گی۔ (ہدایہ، جلد ۲، باب الشہادۃ)

حوالہ۔ ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث لاہور، جلد نمبر ۳۷، شمارہ نمبر ۴)

طلوعِ اسلام

قرآنِ کریم میں لکھا ہے۔

زنا و مبادیاتِ زنا

(۱) جو عورت کسی ایسی حرکت کی مرتکب ہو جو زنا کی طرف لے جانے والی ہو (یعنی زنا نہیں بلکہ عام بے حیائی کی باتیں جو رفتہ رفتہ زنا کی طرف لے جاتی ہیں)، تو اس کے لئے چار گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر اس طرح جرم ثابت ہو جائے تو اسے باہر آنے جانے سے روک دیا جائے۔ (۴/۱۵)۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی ہوگی۔

(۲) شادی شدہ عورت سے کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب ہو تو اس کے مہر میں سے کچھ وضع کیا جا سکتا ہے (۴/۱۹)۔

(۳) زانی مرد اور عورت کی سزا سو سو کوڑے ہے جو ایک جماعتِ مومنین کی موجودگی میں دی جائے گی اور اس میں نرمی نہیں برتی جائے گی ــــ (۲۴/۲)۔ اگر لونڈی سے یہ جرم سرزد ہو، تو اس کی سزا نصف (پچاس کوڑے) ہوگی۔ (یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب عربوں کے ہاں لونڈیاں اور غلام ہوا کرتے تھے۔ قرآن نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا) ــــ (۴/۲۵)۔ (اگر بفرضِ محال نبی کی بیویوں سے یہ جرم سرزد ہو تو ان کی سزا دوگنی مقرر

کی گئی تھی۔ (۳۰/۳۳)

زنا سے مراد زنا بالجبر نہیں بلکہ وہ غیر قانونی جنسی اختلاط ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل ہو۔ (۲۴/۳)۔ زنا بالجبر میں مجرم صرف مرد ہوگا اور وہ دوہرے جرم کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ یعنی خود زناکاری کا اور ایک عفت مآب خاتون کی جبراً عصمت دری کا۔

تہمت

(۱) پاک دامن عورتوں کے خلاف تہمت لگانے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار گواہ لائے۔ اگر جرم ثابت نہ ہو، تو تہمت لگانے والے کی سزا اسّی کوڑے ہے۔ اس کے بعد ایسے شخص کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ ہاں اگر یہ توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلے تو معافی دی جاسکتی ہے۔ (۵۔۲۴/۴، ۲۴/۲۳)۔

(۲) جو شخص خود اپنی بیوی کے خلاف تہمت لگائے اور گواہ نہ لاسکے تو وہ چار مرتبہ قسم اٹھائے اور پانچویں مرتبہ اپنے اوپر لعنت وارد کرے۔ لیکن اگر بیوی بھی اسی طرح اپنی بے گناہی کی قسم اٹھائے، تو پھر اسے مجرم نہیں سمجھا جائے گا۔ (۹۔۲۴/۶)

(۳) کسی کے خلاف غلط افواہیں پھیلانا جس سے اس کی شرافت داغدار ہو، سنگین جرم ہے اور اس کی سزا شہریت کے حقوق سے محرومی سے لے کر قتل تک ہے۔ (۶۰۔۳۳/۵۹)۔ (۶۰/۱۲)۔

(۴) جرم خود کرے اور تہمت دوسروں کے سر باندھے۔ (۴/۱۱۲)۔

اہم تصحیح

طلوعِ اسلام کے شمارہ فروری ۱۹۸۷ء میں "ذکر و فکرِ پرویزؒ" کے مضمون میں صفحہ ۲۱ پر سطر ۱۲ میں قرآن کریم میں "الاعلیٰ" کے بعد درج ذیل عبارت سہواً کتابت ہونے سے رہ گئی تھی۔ احباب تصحیح فرمالیں۔

"خدا کے لئے آیا ہے، اس اعتبار سے دیکھئے تو ابوالاعلیٰ کے معنی ہوں گے (معاذ اللہ) اللہ کا باپ، لیکن ہم"

نقد و نظر

نام کتاب : اقبالؒ کا نظریۂ تعلیم۔ (مجموعۂ مقالات)
تالیف : خادم علی جاوید، ایم۔ اے۔ لائبریرین اقبال اکیڈمی، لاہور۔
ناشر : محمد عمر دراز ، ضخامت : ۱۴۸ صفحات ، قیمت : ۸۰ روپے پیپر بیک۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے ہاں کے تعلیمی نظام کے خلاف یوں صدائے احتجاج بلند کی تھی کہ

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

قوموں کی تعمیر میں تعلیم کا کردار کتنا اہم ہوتا ہے، اس کے متعلق کہا گیا کہ :

یوں قتل کے بچوں سے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ہمارے ہاں دینی تعلیم کے نام سے قوم کے نونہالوں کو جس طرح مصافِ زندگی کی جدوجہد سے فرار سکھائی جاتی ہے او
انہیں ایک خاص مقصد کے سوا کس طرح باقی لوازماتِ حیات کے ناقابل بنایا جاتا ہے۔ اس پر حضرت علامہ نے یو
روشنی ڈالی ہے کہ

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کے چراغ

اسی طرح انہوں نے یورپ کی تعلیم کے متعلق بڑے ہی دردانگیز لہجہ میں فرمایا کہ :

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکارِ سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

ان کے نزدیک تعلیم میں دینی اور دنیاوی ثنویت مہلک ہے۔ انہوں نے جوانانِ قوم کو یہ پیغام دیا کہ :

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

کتاب زیرِ نظر حضرت علامہ اقبالؒ کے تعلیمی نظریات پر متعدد اصحابِ علم کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ امید ہے کہ خادم علی جاوید صاحب کی یہ کاوش ہمارے تعلیمی ماہرین کے لئے نشانِ راہ کا کام دے گی۔

یہ کتاب النور پرنٹرز و پبلشرز پوسٹ بکس ۱۹۰، لاہور ۵۴۵۰۰ اور مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار سے دستیاب ہے۔

نام کتاب : اقبالؒ کا مردِ مومن (مجموعہ مقالات)
تالیف : خادم علی جاوید ایم۔اے۔
ناشر : محمد عمر دراز، چیف ایگزیکٹو النور پرنٹرز و پبلشرز۔
ضخامت : ۱۳۲ صفحات، قیمت : ۶۰/- روپے، پیپر بیک۔

علامہ اقبالؒ کی تعلیم کا ماحصل اُمتِ مسلمہ میں "مردانِ مومن" پیدا کرنا ہے کیونکہ ان کی نظر میں صرف مردِ مومن ہی انسانی زندگی کی اس نہج پر چلا سکتا ہے جو خالقِ کائنات نے اس کے لئے پسند فرمائی ہے۔ علامہ مردِ مومن کے مقامِ بلند سے یوں روشناس کراتے ہیں کہ:

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

حضرت علامہ کی اس تعلیم کو مختلف اصحابِ علم نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ خادم علی جاوید صاحب نے، جو اقبال اکیڈیمی میں لائبریرین ہیں، اس موضوع پر متعدد مقالات جمع کئے اور النور پرنٹرز و پبلشرز نے انہیں شائع کیا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اس کتاب میں موضوع زیرِ نظر پر ہر علمی سطح کے مقالات آ گئے ہیں۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ جیسے اقبالؒ شناس کے رشحاتِ قلم بھی اور تلامذہ کی کاوشیں بھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک مفید پیش کش ہے اور علامہ اقبالؒ کی تعلیمات کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے سامنے لاتی ہے۔

یہ کتاب النور پرنٹرز و پبلشرز، پوسٹ بکس ۱۹۰ لاہور ۵۴۵۰۰ اور مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور سے دستیاب ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالودود

نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ

ماہنامہ 'طلوعِ اسلام' فروری ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں میرے مضمون "نفسِ واحدہ" پر محترم اعزاز الدین خان صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جو میرے خیال میں سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اعزاز الدین صاحب کا موقف یہ ہے کہ 'نفسِ واحدۃ' کی اصطلاح کا اشارہ انسان کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے اور نفسِ واحدۃ سے قرآن کی مراد تخلیقِ انسانی کی پہلی کڑی ہے۔ یہ میری تحقیق کے مطابق حقیقت سے مطابق نہیں رکھتا۔

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں بیان کیا تھا کہ 'نفسِ واحدہ' سے مراد وہ خلیہ ہے جو نر نسبتی خلیئے اور مادہ نسبتی خلیئے کے ملاپ سے معرضِ وجود میں آتا ہے جسے سائنس کی اصطلاح میں ZYGOTE کہا جاتا ہے اور جس کا اردو ترجمہ 'جفتہ' کیا گیا تھا۔ اور یہ کہ نہ صرف انسان بلکہ ہر جاندار شے جو صنف کے ذریعے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اسی خلیے سے اس کی پرورش کا آغاز ہوتا ہے۔

درحقیقت کرۂ ارض قرآن کی اصطلاح میں 'یوم' اور سائنس کی اصطلاح میں AZOIC PERIOD میں معرضِ وجود میں آیا اور اجرامِ فلکی کے باقی کرّے بھی اسی دور میں سامنے آئے۔ پھر کرۂ ارض کے تخلیقی مراحل میں پہلا دور وہ تھا جس میں کیمیائی ارتقاء (CHEMICAL EVOLUTION) جاری رہی لیکن ابھی زندگی کی نمود نہیں ہوئی تھی۔ پھر دوسرے مرحلے میں زندگی کا ارتقاء (EVOLUTION OF LIFE) سامنے آئی۔ پھر اس کے بعد انسانی ارتقاء (HUMAN EVOLUTION) شروع ہوگئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تینوں قسم کی ارتقاء یکے بعد دیگرے واقع ہوئیں۔ بلکہ یہ کہ پہلے کیمیائی ارتقاء پر زندگی کی ارتقاء کا اضافہ ہوا اور پھر اس سے اگلے مرحلہ پر کیمیائی ارتقاء اور زندگی کے ارتقاء پر انسانی ارتقاء کا اضافہ ہوا۔

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں کیمیائی ارتقاء کو ماہ اگست ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں بیان کیا تھا جس میں مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی کا حوالہ درج تھا۔

هو الّذی خلقکم من تراب (۴۰/۶۵) "اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا مٹی (بے جان مادہ) سے کی"

هو الّذی خلق من المآء بشرا...... (۲۵/۵۴) "اور وہی تو ہے جس نے انسانوں کو پانی سے پیدا کیا"

هو الّذی خلقکم من طین (۶/۲). "وہی تو ہے جس نے تمہیں گارے سے پیدا کیا"

خلقهم من طین لازب (۳۷/۱۱) "انہیں ہم نے چپکتے ہوئے گارے سے بنایا"

(یہاں اشارہ انسان کے علاوہ تمام زندہ اجسام کی طرف ہے)

ولقد خلقنا الانسان من سللة من طین (۲۳/۱۲). "اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے
راکیا"

خلق الانسان من صلصال کالفخار (۵۵/۱۴). "اس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی
ے بنایا"

اب اگر ہم اعزاز الدین صاحب کے اس استدلال کو درست تسلیم کریں کہ خلقکم من نفس واحدة' سے مراد خلیقِ انسانی کی پہلی کڑی ہے، تو پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ

خلقکم من تراب' سے مراد مٹی انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی.

اور خلق من المآء بشرا' سے مراد پانی انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی.

اور خلقکم من طین' سے مراد گارا انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی.

اور هو الّذی خلقکم من سللة من طین' سے مراد مٹی کا خلاصہ انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی.

اور خلق الانسان من صلصال کالفخار' سے مراد ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی تخلیقِ انسانی کی پہلی کڑی ہے."

چنانچہ اگر اعزاز الدین صاحب کے استدلال کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تخلیقِ انسانی کا ُغاز مختلف اوقات میں مختلف اشیاء سے ہوا. کیا اسے عقل تسلیم کرتی ہے؟ ہرگز نہیں. مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہے کہ یہ واقعات زندگی کی نمود سے پہلے ہوئے. ان آیات کو فرداً فرداً لیا جائے، تو مطلب واضح نہیں ہوتا لیکن تصریفِ یات سے مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے. مندرجہ بالا آیات میں کیمیائی ارتقاء بیان کیا گیا ہے جو نہ صرف انسان ہر زندہ شے ی تخلیق کی بنیاد ہے.

پھر قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا —

خلق الانسان من نطفة (۱۶/۴). "انسان کی تخلیق نطفہ سے ہوئی."

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج..... (۷۶/۲) "ہم نے انسان کی تخلیق ملے جلے نطفہ سے کی."

چنانچہ اعزاز الدین صاحب کے نکتۂ نظر سے ہمیں ماننا پڑے گا کہ نطفہ انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی ہے۔ اور اسی طرح "نطفہ امشاج" بلاجلا نطفہ بھی تخلیق انسانی کی پہلی کڑی ہے۔

یاد رہے کہ نہ مٹی، نہ پانی، نہ گارا نہ کھنکھناتی ہوئی خشک مٹی، نہ نطفہ، نہ نفس واحدہ (نطفہ امشاج) ان میں سے کوئی بھی چیز انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی نہیں، بلکہ یہ کرۂ ارض کی تخلیق کے نشانِ راہ ہیں، جن میں سے گزر تخلیق نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہ ارتقار ستہ ایام، چھ مختلف ادوار میں وقوع پذیر ہوئی (۳/۳۲) اور پھر خالق کائنات کی تدبیر سے نیچے سے اوپر کی طرف اٹھتی گئی (۳۲/۴)۔ اس تخلیق کی ابتدائی کڑی کیمیائی ارتقار تھا اور پھر یہ اربوں سال میں مختلف مراحل طے کرتی ہوئی خَلْقًا آخَرَ انسان تک پہنچا۔

قرآنِ کریم نے تخلیقی مراحل کے ارتقار کو صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا جب کہا:

وَ اللہ خلقکم من تراب ثم من نطفۃ ثم جعلکم ازواجاً...
(۳۵/۱۱)

"اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے اور پھر تم کو جوڑا جوڑا بنا دیا۔"

اس آیت میں لفظ "ثُمَّ" اہم ہے جس سے ظاہر ہے کہ کرۂ ارض پر تخلیق یکے بعد دیگرے تین مراحل میں سے گذری۔ ان میں پہلا مرحلہ کیمیائی ارتقار کا تھا جو کہ ۳۰۰۰ ملین یا تین ارب سال تک جاری رہا جسے قرآن کی اصطلاح میں 'یومین' اور سائنس کی اصطلاح میں (AZOIC PERIOD) یعنی "زندگی کے بغیر دور" کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی وہ آیات جو مٹی، پانی، گارا، کھنکھناتی مٹی اور مٹی کے خلاصہ کے متعلق ہیں وہ سب اسی کیمیائی دور کے متعلق ہیں۔ اس خلقکم من تراب" کے دور کے بعد اگلے ۱۵۰۰ ملین سال (۱۵ ارب ۵۰ کروڑ) "ثم من نطفۃ" کا دور رہا۔ یہ وہ دور تھا جس میں زندگی کی نمود خلیوں کے اندر ہوئی اور ہر خلیہ بذاتِ خود ایک تخلیقی اکائی تھا جو اپنی نسل کو آگے بڑھانے والی مشنری خود خلیہ کے اندر موجود تھی۔ اس مرحلے پر یہ بیان دلچسپ ہوگا کہ احسن الخالقین کی بے مثل تخلیق کا مظاہرہ ہر خلیے کے اندر موجود ہے۔ خلیے کا سائز چند مائیکرو ملی میٹر ہے (۱۰۰۰ مائکرو ملی میٹر = ۱ ملی میٹر)۔ اس خلیے کے اندر نوات بھی موجود ہے جو اس میں زندگی کے تمام اعمال کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس میں ربوسومز، خام مال سے خوراک تیار کرنے کی فیکٹریاں موجود ہیں۔ اس میں مائیٹو کانڈریا، انرجی منتقل کرنے کی مشینری موجود ہے۔ اس میں گالجی باڈیز، رطوبتیں جسے موبل آئیل کہہ سکتے ہیں، پیدا کرنے والی مشینری موجود ہے۔ اس میں پلاسٹڈز، سورج کی روشنی کے زیرِ اثر غذا پیدا کر کے اسے سٹور کرنے کا عمل موجود ہے۔ اس میں ویکیولز، کی گاڑیاں موجود ہیں جو فالتو مادے کو خلیے کے اندر سے باہر لے جاتی ہیں۔ پھر بغور دیکھئے کہ اس کے اندر سنٹریولز موجود ہیں۔ سنٹریول ایک چھوٹا سا دانہ ہے جو خلیے کی تولید کے وقت متحرک ہوتا ہے جس کی بنا پر خلیہ بذاتِ خود نطفہ قرار پاتا ہے۔ خلیہ (BINARY FISSION) مثنیٰ انشقاق کے عمل سے تقسیم

ہوتا ہے جس میں (CYTOPLASM) مایہ خلیہ اور (NUCLEUS) جسے مرکزِ عصبی یا نوات بھی کہتے ہیں، دونوں ایک ساتھ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ خلیے کے اندر مورثوں کی تعداد دگنی ہو جاتی ہے اور ان میں سے بالکل ایک طرح کے دو سیٹ تیار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی خلیئے کی تقسیم کو MITOSIS یا خیطیت کہتے ہیں۔ اس میں تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے دونوں خلیئے اصل خلیے کا ہو بہو عکس ہوتے ہیں۔ اس تقسیم کا عمل چار مراحل پر مشتمل ہے۔

پھر مزید کئی ملین سالوں کے بعد تخلیق کا تیسرا مرحلہ یعنی "جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا" آیا۔ اس مرحلہ میں ـــــ (UNICELLULAR ORGANISMS) یک خلیہ اجسام بھی باقی رہے لیکن اس کے ساتھ (MULTI-CELLULAR ORGANISMS) کثیرالخلایہ اجسام بھی معرضِ وجود میں آ گئے۔ ان کثیرالخلایہ اجسام (جن میں نباتات حیوانات اور انسان بھی شامل ہیں)۔ باقی جسم میں تو خلیے عام قاعدے یعنی مثنٰی انشقاق کے عمل سے تقسیم ہوتے رہے۔ لیکن ان میں نسل کو آگے بڑھانے کی مشینری تبدیل ہو گئی۔ یہ مشینری جسم کے خاص اعضاء میں منتقل ہو گئی جنہیں مرد میں خصیہ اور عورت میں خصیۃ الرحم کہتے ہیں۔ خصیہ اور خصیۃ الرحم کے اندر نر اور مادہ صنفی خلیے پیدا ہوئے جو علیحدہ علیحدہ تخلیقی اکائی نہیں بلکہ جن میں نر اور مادہ صنفی خلیوں کے اختلاط سے تخلیقی اکائی بنتی ہے۔ یعنی اب تولید کا عمل نطفے سے نہیں بلکہ نطفہ امشاج سے شروع ہو گیا۔ یہی نطفہ امشاج سائنس کی زبان میں ZYGOTE (جفتہ) اور قرآن کے الفاظ میں نفسِ واحدہ کہلایا۔

(تصویر 1) پھر دیکھئے۔ یہ نطفہ امشاج سے تخلیق کا مرحلہ بھی (PRECAMRIAN) کے ڈیڑھ ارب سال کے اندر شروع ہو گیا تھا۔ (GREEN ALGAE) سبز کائی جس کا ذکر میں نے نومبر ۱۹۹۲ء کے شمارے کے صفحہ ۲۹ پر کیا تھا۔ وہ اسی دَور میں پیدا ہو گیا تھا۔

انسان (HOMO SAPIANS) کے ارتقار کی ابتداء PLIOCENE دور میں یعنی آج سے ۵ لاکھ سال پہلے ہو چکی تھی اور انسان کی موجودہ نسلوں کی ابتدا PLEISTOCENE دَور میں آج سے ۵۰ ہزار سال پہلے ہوئی تھی۔ اب غور فرمائیے کہ نطفہ امشاج کی ابتداء (PRECAMBRIAN) میں ہوئی اور انسان (PLEISTO-CENE) میں نمودار ہوا۔ گویا ان دونوں ادوار کے درمیان ۳۰۰ + ۱۳۰ + ۷۵ = ۵۰۵ ملین (ساڑھے پچاس کروڑ) سالوں کا فاصلہ ہے۔ (اس ٹائم ٹیبل کے اعداد و شمار فاسلز کی بنا پر جو زمین کی تہوں میں موجود ہیں، وضع کئے گئے ہیں۔ اس کا حساب لگانے کے لئے کیمیائی اور RADIO-ACTIVE طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ایک کلاک کے ٹائم کی طرح درست ہیں)۔ چنانچہ کون کہہ سکتا ہے "نطفہ امشاج" جسے قرآن نے "نفسِ واحدہ" کہا ہے، انسان کی تخلیق کی پہلی کڑی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہمارے مولوی حضرات بائبل کی تقلید میں کہتے چلے جا رہے ہیں کہ مٹی اور پانی سے

نے ایک پتلا بنایا اور اس میں پھونک مار کر بابا آدم بنا دیا۔ اسی طرح ہمارے نیم ملاؤں میں بھی یہ تصور راسخ ہو چکا ہے کہ انسان براہ راست مٹی اور پانی ہی سے بنایا گیا تھا' وہ اس خیال کو جھٹک کر ذہن سے نکال نہیں سکتے اور خلیے کا نام تو انہوں نے ایسے سُنا سنایا لینا شروع کر دیا۔ خلیہ چیز کیا ہے ؟ یہ خلیے کب پیدا ہوتے ؟ اور مختلف اوقات میں ان کے افعال کیا تھے ؟ ان کو کچھ معلوم نہیں۔

اب قرآن کریم کی آیت (۴/۱) کو پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے:

"اے نوعِ انسان! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا "نفسِ واحدہ" سے کی اور پھر اسی سے تمہارا زوج بنایا۔"

پھر قرآن نے یہ بھی کہا کہ

"تمہاری تخلیق اور بار بار تخلیق کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ 'نفسِ واحدہ' کی مثل ہے"۔ (۳۱/۲۸)

غور فرمائیے کہ کیا مندرجہ بالا آیت کا اطلاق ان خلیوں پر ممکن ہے جن میں ابھی نطفہ امشاج نہیں بنا تھا اور ازواج معرضِ وجود میں نہیں آئے تھے ؟ چنانچہ یہ تصور کہ 'نفسِ واحدہ' سے قرآن کی مراد تخلیقِ انسانی کی پہلی کڑی ہے' نرا جہالت پر مبنی ہے۔

پھر محترم اعزاز الدین صاحب بعض آیاتِ قرآنی کا' جن کا نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں' لے تکے انداز میں سہارا لے رہے ہیں۔ پھر آپ نے پرویز مرحوم کے اس فقرے کا سہارا لینا بھی مناسب سمجھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ " پہلے ایک LIFE CELL تھا جو جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصّوں OVUM اور SPERM میں تقسیم ہو گیا"۔ حقیقتاً کسی غیر صنفی خلیے کا پھٹ کر نر اور مادہ خلیوں میں تقسیم ہونا بے حقیقت بات ہے اور پھر جوشِ نمو سے پھٹنے کے الفاظ شاعرانہ قسم کے ہیں جن کو ہر سائنس دان بہ نظرِ استہزاء ہی دیکھے گا۔ پرویز مرحوم کا اعلیٰ و ارفع علمی مقام مسلّم ہے لیکن مرحوم بالآخر غیر سائنس دان تھے۔ اس نکتہ کی وضاحت میں 'طلوعِ اسلام' شمارہ جولائی کے صفحہ ۱۴ پر پیش کر چکا ہوں۔ استادِ محترم اندھی تقلید کے مخالف تھے۔ آخر ہمیں خود بھی آنکھیں کھول کر قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہے۔

کیا ہم قرآنِ کریم کا ۸/۱ حصہ جو تقریباً ۷۵۰ آیات پر مشتمل ہے اور جو قرآن اور کائنات سے متعلق ہے' اس کی تفسیر جو غیر سائنس دان مفسروں نے بیان کی ہے' اسے اسی طرح من وعن تسلیم کر لیا جائے ؟ یہ بھی یاد رکھئے کہ "نفسِ واحدہ" پر میری یہ تحریر ایسی چیز نہیں جو میں نے آج لکھ کر پیش کی ہے بلکہ یہ حقائق میری پہلی کتاب (PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN) میں درج ہیں جو میں نے آج سے ۲۲ سال پیشتر لکھی تھی اور جس کے مسوّدے کا ایک لفظ پرویز مرحوم نے کتاب کی اشاعت سے پہلے پڑھا تھا' انہوں نے میری تحقیق پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ اس کی تعریف کی۔

پھر اعزاز الدین صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ 'نفسِ واحدہ' سے مراد جفت ہے

تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جفتہ میں سے اس کا زوج کیسے پیدا ہوا؟

اب مصیبت یہ ہے کہ میں اپنے اس بھائی کو سائنس کی 'ڈب' کیسے سکھاؤں۔ بہرحال لیجئے میں بیان کرتا ہوں کہ نطفہ امشاج یا جفتہ سے نر اور مادہ کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر (SPECIES) نوع میں خلیے کے اندر (CHROMO - SOMES) نونیوں کی تعداد مقرر ہوتی ہے۔ انسانی خلیے کے اندر نونیوں کے ۲۳ جوڑے ہوتے ہیں۔

خدا کرے یہ سائنسی حقائق ہماری سمجھ میں آجائیں۔

راجہ عبد الرزاق عادل

ملّتِ پاکستان کے لئے لمحۂ فکریہ!

(۱) اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی، قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی ہے جس کے لئے لامحالہ آپ کو الگ خطۂ زمین ضرور چاہیئے..........!

(حضرت قائدِاعظم محمد علی جناحؒ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء)

(۲) اسلام کا صرف "تڑکا" لگایا ہے چیف جسٹس!

اسلام آباد (جنرل رپورٹر) سپریم کورٹ میں جنرل ریٹائرڈ مرزا اسلم بیگ کو دیئے جانے والے نوٹس کی سماعت کے دوران اسلامی روایات سے متعلق چیف جسٹس کے ریمارکس پر........ فخر الدین جی ابراہیم نے کہا کہ آپ حوالہ اسلامی قوانین اور روایات کا دے رہے ہیں اور سماعت انگریزی قوانین کے مطابق کر رہے ہیں۔ اسلام میں تو اگر جج کسی مقدمہ میں پارٹی ہو تو وہ اس کی سماعت خود نہیں کر سکتا' ہم تو ایسا ایشو سامنے لائے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے' اسلام میں سچ اور انصاف کو اعلیٰ اوصاف قرار دیا گیا ہے اور سچ کو سامنے لانا فرض ہے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ اس وقت آپ بھی انگریزی قوانین کے مطابق کر رہے ہیں کبھی

لے یاد رہے۔ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کا یہ قولِ عظیم قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلق (۱۸/۲۶، ۱۲/۴۰) اسے قرآنی احکام اور اصولوں کے مطابق قائم کرنے (۴۹ـ ۵/۴۸) اور ان احکام اور اصولوں سے انحراف......(۴۷ـ۴۵ـ ۵/۴۴) کے جرم سے متعلقہ ہدایات سے متعلق واضح تشریح پر مبنی ہے۔ نیز اسلامی حکومت کی تعریف اس سے بہتر شاید ہی ممکن ہو........///

اسلام کا "تڑکا" لگانے سے کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (روزنامہ خبریں مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۹۳ء)

(۴) پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستی اور انسانی حقوق کی پامالی پر امریکہ کا اظہارِ تشویش! کلنٹن نے عہدۂ صدارت سنبھالتے ہی اسلام کو اصل مسئلہ قرار دے دیا اور کہا کہ ہم ان ممالک کو امداد دیں گے جو ہماری ہاں میں ہاں ملائیں گے، پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے بارے میں قوانین پر امریکی قیادت سب سے زیادہ تشویش میں مبتلا ہے۔" امریکی وزارتِ خارجہ کی رپورٹ (واشنگٹن "این این آئی" روزنامہ خبریں ۲۳ فروری ۹۳ء)

مندرجہ بالا عظیم قولِ قائداعظم اور ہر دو اقتباس من حیث المجموع افرادِ ملتِ اسلامیہ کے لئے بالعموم اور ان صاحبِ بصیرت اہلِ علم (الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْم) کے لئے (جو بفضلِ تعالیٰ الاسلام (۱۹/۱۳) کو بطور الدین سمجھتے ہیں) بالخصوص جہاں تحریک و قیامِ پاکستان کے عظیم و مقدس مقصد سے متعلق یاددہانی کے لئے پیش کیا گیا ہے وہاں اس امر کی نشان دہی بھی کرنا ہے کہ دستورِ پاکستان میں نفاذِ اسلام سے متعلق ..... ضمانت۔ "تمہید" چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا۔ وہ ایک مقدس امانت ہے ..... جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جس طرح قرآنِ پاک اور سنّت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں!

دفعہ ۳۱ (۱) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی ..... زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لئے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ جن کی مدد سے وہ قرآنِ پاک اور سنّت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں!

دفعہ ۲۰۳ د (۱) عدالت (وفاقی شرعی عدالت) یا تو خود اپنی تحریک پر یا پاکستان کے کسی شہری یا وفاقی حکومت یا کسی صوبائی حکومت کی درخواست پر اس سوال کا جائزہ لے سکے گی کہ آیا کوئی قانون یا قانون کا کوئی حکم ان اسلامی احکام کے منافی ہے یا نہیں جس طرح کہ قرآنِ پاک اور رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت میں ان کا تعین کیا گیا ہے جن کا حوالہ بعد ازیں اسلامی احکام کے طور پر دیا گیا ہے!

نیز! اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، اُردو ترجمہ شائع کردہ حکومتِ پاکستان وزارتِ عدل و پارلیمانی امور، شعبۂ عدل کے صـ۲ پر "تمہید" اب ہم جمہور پاکستان ..... بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اس اعلان سے وفاداری کے ساتھ کہ پاکستان عدلِ عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی" سے کس قدر کھلا ہوا انحراف بلکہ ظلم روا رکھا گیا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک طرف مملکتِ خداداد پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کے محترم و مکرم جناب چیف جسٹس محمد افضل ظلہ صاحب کو افسوس ناک صورتِ حال کا کھلے بندوں اقرار کرنا پڑ رہا ہے (کہ) آج مملکتِ خداداد

پاکستان کے قیام کو نصف صدی گزر جانے کے باوجود مملکت کی عدالتِ عظمیٰ کو خود اپنی توہین جیسے اہم ترین معاملہ میں بھی فیصلہ کرنے کے لئے انگریز (غلامی کے دور) کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق سماعت کرنی پڑ رہی ہے[1] اور دوسری طرف انتہا یہ ہے کہ ہماری آئین و قانون سازی سے متعلق آزادی اور پابندی کے حدود "قرآن پاک" کے احکام کے تابع متعین ہونے کے بجائے "امریکن" حکومت کی امداد کے لئے ہاں میں ہاں ملانے سے متعلق شرائط و پابندیوں کے تابع فرمان ہیں۔ درآنحالیکہ! اوپر پیش کردہ تمہیدی پیراگراف اور آئینی دفعات میں، اللہ تبارک تعالیٰ کی بلاشرکتِ غیرے حاکمیتِ مطلق "یاد رکھو! اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک اللہ ہے اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں" (۱۲/۴۰)۔ فلہٰذا "اس کے حکم کے ساتھ کسی اور کے حکم کو شریک نہیں کیا جا سکتا" (۱۸/۲۶) کے قیام اور اُس (اللہ) کے عطا کردہ اختیار و اقتدار کی مقرر کردہ حد" (اے رسولؐ) تم ان کے فیصلے و حکومت کا قیام، بما انزل اللہ، قرآنی احکام اور اصولوں (۴۹ - ۵/۴۸)" کے مطابق کرو۔ نیز بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اعلان "اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی، قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی ہے"، سے وفاداری سے بے خبر اور مملکتِ خداداد پاکستان کے آئین کی حفاظت اور ضمانت سے متعلق حلف سے لاتعلق مقننہ اور انتظامیہ بڑے جاہ و جلال، تمکنت اور دبدبہ نیز انواع و اقسام کی مراعات اور سہولیات سے شاداں و فرحاں، عہدہ طلبی، اس کے لئے گروہ بندی اور گروہ کو قائم رکھنے کے لئے گروہ و اقربا نوازی میں مشغول و سرگرداں ہیں، نہ کسی کو آئین کے مطالعہ کی فرصت یا ضرورت ہے نہ بانیٔ پاکستان کے اعلان کا علم بلکہ سروکار ہی ہے[2]؟؟؟

چنانچہ! اس صورتِ حال کا تقاضا ہے (کہ) کم از کم صاحبِ بصیرت، اہلِ علم، صائب الرائے افرادِ ملت اس اصلاح طلب

---

[1] یہ نبوت و رسالت کے جھوٹے آئے دن کے دعاوی اور اعلان بھی ملتِ اسلامیہ کے، اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کے قیام (قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی) خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کی بنیاد پر نظامِ امامت (امارت) سے اغماض بلکہ انحراف کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ بنی نوع انسان کی من حیث المجموع ضمیر، خود انسانی ذہن کے تراشیدہ اور وضع کردہ عہدہ طلبی، گروہ بندی اور اقربا نوازی کی بنیاد پر قائم نظام اور متعلقہ نظریۂ حکومت عوام کی حکومت، عوام کی طرف سے، عوام کے لئے فریب کارانہ فارمولا سے کسی طور پر بھی مستفید اور مطمئن نہیں ہے ..... !!!

[2] البتہ آٹھویں ترمیم کو ختم کر کے پارلیمنٹ کے اختیارات (جو سیکولر نظریات کی پیداوار اور انسان پر انسان کی حکومت کے سزاوار ہیں) کو بحال کرنے کی بہرحال فکر لاحق ضرور ہے۔ لیکن آئینِ مملکت میں اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کو قائم کرنے سے متعلق ضمانت بلکہ "عہد" اور قرآن کریم میں متعلقہ احکامات (۴۷ - ۴۵ - ۵/۴۴)، (۴۹ - ۵/۴۸)، (۱۸/۲۶)، (۱۲/۴۰) سے انحراف کے کھلے ہوئے "جرم" کے ارتکاب سے متعلق نہ کہیں سے آواز ہے نہ احتساب کا بندوبست ہی ہے ..... !!! "للعجب"

صورتِ حال کا پوری ذمہ داری، خلوص اور دیانت داری سے نوٹس لیں اور اس سلسلہ میں ان پر اپنے رب، بانیٔ پاکستان کے ساتھ وفاداری اور ملک وملّت کی طرف سے جو مقدس ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسے کما حقہٗ پورا کریں[1]۔

بہترین
دوست وہ ہے جب تم اللہ کو یاد کرو
وہ تمہاری مدد کرے اور جب تم اللہ کو بھلا دو، تو وہ یاد دلائے۔
حدیثِ نبویؐ

بہترین مومن وہ ہے جس کا اخلاق بلند ہو اور اہل و عیال کے
ساتھ محبت اور مہربانی سے پیش آتا ہو۔
حدیثِ نبویؐ

---

[1] بایں نمط؛ عدالتِ عظمٰی کو اپنی توہین کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے ارشاداتِ الٰہی (۴۷-۴۵-۴۴/۵) کے مطابق ملّتِ اسلامیہ نیز پوری نوعِ انسانی کے لئے تنبیہ کے انجام بخیر ہونے سے متعلق اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے..... ///

ملک حنیف وجدانی

اکیسویں صدی کے
تقاضے اور قرآن

(نظریہ، قانون سازی اور قوتِ نافذہ)

قسط نمبر 1

اسلام، اسلام، اسلامی نظام اور نظامِ مصطفےٰ کا دل خوش کُن "ایمانی نعرہ" لگانے والے کم از کم اسلام آباد ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ووٹروں کی اکثریت ان سے "قومی مدبّر" اور "دیدہ ور" ثابت ہونے کی جو توقعات رکھتی ہے۔ وہ ہمیشہ خوابِ پریشاں کی طرح ادھوری رہ جاتی ہیں۔ ان کے منتخب ہیرو "سستی سیاسی شہرت، ہارس ٹریڈنگ اور ذاتی مالی مفادات کے سراب میں گم ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ہر حساس فرد پکار اُٹھتا ہے کہ

وائے ناکامی "متاعِ کارواں" جاتا رہا

اقوامِ عالم "اکیسویں صدی" میں داخل ہونے کے لئے برق رفتاری سے جامع ترین منصوبہ بندی کر رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ توانا ہیں اور ہم ناتواں۔ وہ قوی و صحت مند ہیں اور ہم لاغر و بیمار۔ آہ! کہیں سُست رفتاری میں ہم کچلے نہ جائیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ اپنے آپ کو محفوظ بناتے ہوئے اقوامِ عالم کے شانہ بشانہ، قدم بقدم بلکہ مسابقت میں ان سے آگے بڑھنے کا پروگرام ترتیب دیں تاکہ ہم اپنے ذاتی ایمان اور ملّی تشخص کو منوانے کی پوزیشن میں رہیں۔ آیئے! اس سے متعلق چند خدوخال کا ذکرِ خیر کر کے انہیں متعیّن کرنے کی کوشش کریں۔

۱۔ دو قومی نظریہ

تحریکِ پاکستان کا "جذبۂ محرکہ" دو قومی نظریہ تھا کہ "مسلم" غیر مسلم افراد کے مقابلہ میں ایک قوم ہیں، ایک مرکز کعبہ، ایک کتاب قرآن اور ایک رسول جناب محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے ہیں۔ ہماری قومیت وطن، زبان یا رنگ سے نہیں بنتی۔

قیامِ پاکستان کے وقت کا جذبہ سامنے لایئے! حقیقتاً عملی طور پر ہم تمام "مسلمان" ایک قوم اور ایک اسلام

والے تھے۔ جبکہ آج پنجابی، بلوچی، سندھی اور پختون الگ الگ قوم بن بیٹھے ہیں۔ بلکہ اُن میں مہاجرین کی ایک نئی قوم کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور وہ اپنے آپ کو منوانے کی پوزیشن میں ہیں۔ یہ دو قومی نظریہ سے غداری، اس سے مذاق اور عملاً نفرت کا اظہار ہے۔ "نظریۂ پاکستان" بڑا اچھا ہدف رہا۔ لیکن ہم عملاً اس کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ ہر نظریہ! نظریہ کی حد تک اچھا وعظ رہ سکتا ہے اور بس! جب تک نظریہ کے تحفظ کے لئے قانون سازی نہ کی جائے اُس کے مستقل تحفظ کی ابتدا نہیں ہو سکتی اور قانون سازی کے بعد "قوتِ نافذہ" ہی اس کی محافظ و سرپرست بن سکتی ہے۔ بے قانون سرپرست و محافظ کا درجہ اعزازی تو ہو سکتا ہے چیلنج کرنے والا نہیں ہو سکتا۔

دو قومی نظریہ کا وعظ اکیسویں صدی میں جاری نہیں رکھا جا سکے گا جب تک اس کے لئے مؤثر قانون سازی کی بنیاد موجود نہ ہو۔ میں طلوعِ اسلام کی سوچ سے متفق قانون دان حضرات سے پُرزور استدعا کروں گا کہ وہ دو قومی نظریہ کی قانون سازی کے لئے کوئی تبت، دیرپا اور ٹھوس لائحہ عمل سامنے لائیں اور اس کے لئے تحریک پیدا کریں۔

میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ

۱۔ محکمہ مال، محکمہ تعلیم، محکمہ شماریات اور دیگر اداروں میں "قومیت" کو صرف "مسلم" یا "غیر مسلم" تک مخصوص کر دیا جائے اور شناختی کارڈ میں بھی ایسا ہی اندراج ہو۔ اس کے لئے قانون سازی اور بذریعہ عدلیہ تحریک کا آغاز کیا جائے۔

۲۔ صوبائی، لسانی یا شعوب و قبائل پر مبنی تمام سیاسی پارٹیاں، رجسٹرڈ انجمنیں، سوشل ویلفیئر سوسائٹیاں اور ہر قسم کی تنظیمیں ختم کی جائیں۔

۳۔ پیشہ، گوت اور قبیلہ کا اندراج بحیثیت "قوم" ممنوع قرار دیا جائے اور اس کے لئے خاندانی تعارف صرف تین پشتی اندراج مثلاً "زید ولد اکبر ولد حاتم" سے کام چلایا جائے۔ اس سے قوم گوجر، قوم مغل، قوم سنّی وغیرہ وغیرہ کے دھندے سے نجات مل جائے گی۔

۴۔ صوبائیت کے حامل بنک ختم کر دیئے جائیں۔

۵۔ جب تک قرآن کریم کو "سپریم لاء" کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا۔ سیاسی پارٹیاں موجود ہیں تو اس عبوری دور میں صرف ان سیاسی پارٹیوں کو کام کرنے کی اجازت دی جائے جن کی جڑیں چاروں صوبوں اور مہاجرین میں ہوں۔ سیاسی پارٹیوں کی شکست و ریخت الیکشن کے موقع پر ہوتی ہے۔ الیکشن کے بغیر پارٹی بدلنے کو ممنوع قرار دیا جائے اور جو کوئی اپنی پارٹی بدلے اسے مستعفی ہو کر دوبارہ الیکشن میں حصہ لینا چاہیئے۔

۶۔ الیکشن میں خود امیدوار بننے کو ممنوع قرار دیا جائے۔ کونسلر کے الیکشن میں اس کو حصہ لینے کی اجازت ہو جس کو "۵۰" ووٹروں نے نامزد کیا ہو۔ اور ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے کے الیکشن میں وہ حصہ لے جس کو "۵۰" کونسلرز نامزد کریں۔ اس طرح یہ مشاورت کے ادارے اچھے لوگ سامنے لا سکیں گے۔

۷۔ اقوامِ عالم کے سامنے "مسلم قومیت" کا نعرہ ایک حقیقت بنانے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہماری قومیت عراقی رہے نہ ایرانی، قومیت مصری رہے نہ شامی، قومیت پاکستانی رہے نہ افغانی۔ بلکہ

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا

ہمیں پوری دنیا میں "دو قومی نظریہ" کے ابلاغِ عامہ اور قانون سازی کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر "مسلم قومیت" ایک پہچان بن سکے گی۔

؎ اے خدا ایں آرزوئے من چہ خوش است

اگر مسلم سربراہوں کی سالانہ کانفرنس حج بیت اللہ کے موقع پر ہو جایا کرے تو ہماری کامیابی اور منزل کا حصول بہت آسان ہو سکتا ہے۔ یوں "امامِ ملتِ اسلامیہ" کے انتخاب کی تحریک پیدا ہوگی۔ جناب علامہ محمد اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

؎ اجتماعیت کے اُوپر ہے بنا اسلام کی — دیکھتا ہوں میں اِدھر مُسلم کو پھر آتا ہوا
اِس رواقِ نیلگوں میں مجھ کو آتا ہے نظر — اپنی ملت کا ستارہ نور برساتا ہوا

ملت کا نور برسانے والا "ستارۂ مقدر" نظر نہیں آتا اور ہماری آنکھیں اس کے لئے ترس گئی ہیں۔

۲۔ متبادل معاشی نظام

یہودی اور ہندو ذہنیت کا پروردہ "سودی نظام" بنکنگ نظام کی وساطت سے اقوامِ عالم میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ بنکنگ کا نظام سود کے بغیر چل نہیں سکتا۔ امیر و غریب کی بچت سود کے بغیر پُرکشش بنائی نہیں جا سکتی۔ جملہ اسلامی ممالک اس کی گرفت میں آ گئے ہیں۔ آج کا انسان حیران ہے! سود کے ساتھ سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، رشوت، بھتہ، بٹائی، نصف، پگڑی، مارکیٹوں اور پلازوں کی کروڑہا کی کرایہ داری سے جنم لینے والا کالا دھن ملک و قوم کے لئے المیہ بن چکا ہے۔ اس پر ڈاکہ زنی، اغوا برائے تاوان اور دیگر ایسے ہی ذرائع نے دولت کا بہاؤ شرفاء و غریب طبقہ اور متوسط طبقہ سے دُور کر کے ایک "باغی نَو دولتیہ" طبقہ کی طرف کر دیا ہے۔ جس کو پھانسنے کے لئے حکومت طرح طرح کے جال بچھا رہی ہے۔ تاکہ ان کی دولت کو قومی ترقی کے دھارے میں شامل کیا جائے۔ ان کو انکم ٹیکس سے چھوٹ، زکوٰۃ سے چھوٹ اور دولت کمانے کے جواز کی چھوٹ کے ساتھ میدانِ معاشیات میں لایا جا رہا ہے۔ جب کہ غریب، مزدور، تنخواہ دار طبقہ مہنگائی اور

بے روزگاری کے دو پاٹوں میں پس کر آٹا بن رہا ہے۔ عوام، خواص، جاہل علماء، حکمران اور عام شہری اس صورت حال سے خوف زدہ ہیں۔ جب کہ امیر نو دولتیہ طبقہ ان حالات میں بھی مطمئن ہے اور حکومت کی طرف سے نئی مراعات کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا حل سود کے بغیر بنکنگ نظام ہے جس کا حل کہنے کو تو جناب مولانا طاہر القادری صاحب نے لاہور کے جلسۂ عام میں پیش کیا۔ اس کے کچھ خدوخال ملاحظہ ہوں۔ (یہ حل نامکمل دوسروں کے چربے والا اور مسلم اخوتی وحدت والا نہیں)۔

۱۔ سود کی ادائیگی۔ "۹۲-۱۹۹۱ء میں اندرونی و بیرونی قرضہ جات پر سود کی ادائیگی کی رقم ۶۲ ارب ۳۷ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے ہو چکی ہے۔" (پندرہ روزہ تحریک لاہور - ۳۱ اکتوبر ۹۲ء)۔

۲۔ "پوری قوم سود خوروں کے پاس گروی ہو چکی ہے۔" (ایضاً)

۳۔ "(مخالفین نے) ملازم کی آڑ میں اس قدر زہر اگلا ہے اور علمائے کرام کے خلاف اس قدر ذلت آمیز زبان درازی کی ہے جس کی مثال گذشتہ نصف صدی میں نہیں ملتی۔" (ایضاً)

۴۔ "مشرقِ وسطےٰ اور مغربی ممالک میں ایک سو کے قریب چھوٹے بڑے اسلامی بنک اور اسلامی مالیاتی ادارے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔" (ایضاً)

۵۔ "قرض حسنہ اکاؤنٹ کا تجربہ ملی بنک ایران میں غیر معمولی کامیابی کا باعث بنا ہے۔" (ایضاً)

۶۔ "بنک فقط اپنے انتظامی اخراجات پورا کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس سے زائد نفع لینا کلیتاً ممنوع ہوگا۔" (ایضاً)

۷۔ حبیب بنک اپنے اوائل دور میں ضرورتمند دکانداروں اور چھوٹے کاروباری لوگوں کو پانچ ہزار روپے تک قرض حسنہ فراہم کرتا رہا ہے۔" (ایضاً)

۸۔ "بنک کا کمیشن ADVANCE ادا کیا جائے اور قرضہ بلا سود ہوگا۔" (ایضاً)

اس کے علاوہ انہوں نے زرعی بنکاری، صنعتی بنکاری اور تجارتی بنکاری کی مثالیں دی ہیں۔ البتہ کرایہ داری اور "اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ" کی طرف نہیں آئے اس لئے یہ حل نامکمل اور پرکشش نہ بن سکا۔

اس کے برعکس جناب محمد حنیف رامے صاحب نے اپنے جنگ کے مضمون میں یہ عندیہ دیا ہے کہ علماء سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے زرخرید ہیں۔ یہ کرایہ داری، بٹائی، نصف اور مزارعت کے خلاف نہیں بولتے۔ آپ نے چھوٹے کھاتہ داروں کے بچت کے منافع کو جائز قرار دیا ہے اور چھوٹے کھاتہ داروں کے نفع کا دفاع کیا ہے۔

جہاں تک سودی نظام کے برعکس "متبادل معاشی نظام" کا تعلق ہے۔ اس پر سب سے پہلے جناب علامہ غلام احمد پرویز صاحب مرحوم و مغفور نے منفرد انداز میں کام کر کے اسے اپنی کتاب "نظامِ ربوبیت" میں پیش کیا جو سودی نظام کا بہترین اخوتی، محنتی، احسانی، عدلی اور فلسفۂ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ پر مبنی توڑ ہے۔ میں تمام مفکرینِ قوم اور دانشورانِ ملت

اسلامیہ کو دعوت دوں گا کہ وہ اس اہم کتاب "نظامِ ربوبیت" پر از سرِ نو غور فرمائیں۔ یقیناً یہ کتاب اس قابل ہے کہ اِسے قومی دستاویز کے طور پر قبول کر کے مصنّف کو صدارتی ایوارڈ دیا جائے اور متبادل معاشی نظام کے لئے اس کتاب کو بنیاد بنا کر قانون سازی کی جائے۔ اسی طرح ؎

"شاید اس کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے"

جہاں تک "نظامِ ربوبیت" کے قیام کے لئے قانون سازی کا تعلق ہے، میں بنیادی طور پر اس کو اہمیت دونگا کہ

۱۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے جلد از جلد الگ کیا جائے۔

۲۔ صوبائی محتسبِ اعلیٰ مقرر کئے جائیں یا وفاقی محتسبِ اعلیٰ کے اختیارات میں پورا پورا اضافہ کیا جائے۔

۳۔ میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ بنی اسرائیل ہر سات سال بعد "چھٹکارا" کا سال رکھتے تھے جس میں غریبوں کے قرضے، بقایا جات اور وعدے سب کے سب ختم ہو جاتے تھے۔ بلکہ چھٹکارا کا سال آنے سے پہلے ایک سال امیر لوگ غریبوں کو قرضہ نہیں دیتے تھے کہ یہ آئندہ سال چھٹکارا میں ختم ہو جائے گا۔ اس پر اللہ کی طرف سے ان کو وارننگ ملی تھی۔ تورات آسمانی کتاب ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے تو اس کتاب کے نور سے ہمیں بھی روشنی کا حصّہ لینا چاہیئے۔ میں مسلمان حضرات علماء و مشائخ سے درخواست کروں گا کہ وہ چھٹکارا کا سال تجویز کریں تاکہ ہمارے غریبوں، یتیموں، مسکینوں، مقروضوں، بے مکانوں اور بے زمینوں کا کوئی حل پیدا ہو سکے۔ قرآنی نظام کا نقطۂ ماسکہ اور عملی مظہر فلسفہ و نظام "قُلِ الْعَفْوَ" ہے کہ ضرورت سے زیادہ سب کچھ دے دیا جائے۔ خدا کے لئے پاکستان پر "چھٹکارا" یا "قُلِ الْعَفْوَ" کا دور آنے دیجئے۔ اس کے لئے قانون سازی کی تحریک پیدا کیجئے۔ یہی دو چیزیں مسلم معاشرہ سے غریبی، محکومی، مسکینی اور ناداری کا خاتمہ بیسویں صدی میں کر سکتی ہیں۔

۴۔ "اَلْاَرْضَ لِلّٰہِ" پر ریسرچ کے نقطۂ نظر سے ۵ (پانچ) اسکالرز کو پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ اس پر مزید تحقیق ہو اور قانون سازی کی جا سکے۔ ہمارے "محبوب دیدہ ور" اور پی ایچ ڈی جناب محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ

باطنِ اَلْاَرْضَ لِلّٰہِ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

لیکن بات کو قانونی انداز سے آگے بڑھانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

۵۔ رہائش انسانی استحقاق ہے۔ ایک جگہ کی رہائش کو چاہے شہری ہو یا دیہاتی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور جو افراد ڈبل رہائش یا کئی دیگر شہروں میں رہائش رکھتے ہوں ان پر زکوٰۃ سے دوگنا یعنی ۵٪ ٹیکس وصول

کیا جائے اور یہ آمدن بے مکان اور بے زمین افراد کی بحالی پر صرف کی جائے۔

۶۔ قومی بچت کے لئے "اسٹیٹ لائف انشورنس" کو لازمی قرار دیا جائے جو ہر ملازم کو ملازمت کے ساتھ ضرور لینی پڑے۔ اسٹیٹ لائف انشورنس، ممبران کی ویلفیئر سوسائٹیاں، ہسپتال، سکول اور دیگر ادارے قائم کئے جائیں۔ ان کے لئے برلبِ سٹرک مارکیٹیں، پلازے اور یوٹیلٹی سٹورز قائم کئے جائیں۔ اس طرح ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

۷۔ "بنک حصص شراکت" میں امیر و غریب سب کو یکساں حقوق دئے جائیں۔ مثلاً اگر ایک حصہ کی قیمت "دس ہزار روپے" ہے، تو خاندان کا ایک آدمی صرف ایک حصہ خرید سکے اور بس! باقی حصص پبلک اجتماعات میں فروخت کرنے کی تحریک پیدا کی جائے۔

۸۔ سونے کے زیورات کا اندراج شادی کے موقع پر نکاح نامہ پر کیا جائے اور زیورات پر زکوٰۃ عائد کی جائے۔

۹۔ زمینداران پر عشر کا نفاذ کیا جائے۔

۱۰۔ باغات پر عُشر عاید کیا جائے۔

۱۱۔ گلہ بانوں پر عشر عاید کیا جائے۔

۱۲۔ تمام کلمہ گو مسلمانوں پر زکوٰۃ بلا استثنا نافذ کی جائے۔

(باقی آئندہ)

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

بول چال

(۸)

صاف بات بات ہمیشہ ایسی کرو جو سیدھی، واضح اور صاف ہو۔ جس میں کسی قسم کا پیچ نہ ہو۔ جو ذومعنی نہ ہو۔ یعنی ایسی بات نہ ہو کہ اِس وقت اُس کا مطلب کچھ اور نکالو اور دوسرے وقت میں کچھ اور مطلب نکالو۔

قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ (۳۳/۷۰)

"ہمیشہ صاف، واضح، محکم، سیدھی بات کرو۔"

شائستہ گفتگو شائستہ اور مہذّب گفتگو کرو۔

قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ (۴/۵)

"ایسی زبان بولو جو معاشرہ میں شریفوں کی زبان تسلیم کی جاتی ہو۔"

اچھی اچھی باتیں نہایت خوبصورت انداز سے، اعتدال کے ساتھ باتیں کرو۔ ایسی باتیں جو بہت اچھی ہوں۔

يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۷/۵۳)

"خوبصورت انداز سے اعتدال کو قائم رکھتے ہوئے اچھی اچھی باتیں کرو۔"

جھوٹ اور فریب مکر و فریب، تصنّع اور بناوٹ، چال بازی اور فریب کاری کی باتیں کبھی نہ کرو۔

اِجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰)

عدل و انصاف کی باتیں

بے انصافی کی بات کبھی نہ کرو۔

اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا۔ (۶/۱۵۳)

"جب بھی بات کرو عدل و انصاف کی کرو۔"

سچ کو مت چھپاؤ

سچ کو کبھی نہ چھپاؤ اور نہ ہی سچ کے ساتھ جھوٹ کو ملا کر بیان کرو۔

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ ۝ (۲/۴۲)

"سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط مت کرو۔ نہ ہی حق کو چھپاؤ۔"

چیخ چیخ کر باتیں کرنا

چیخ چیخ کر باتیں مت کرو۔ آواز کو نیچا رکھو۔

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝ (۳۱/۱۹)

"اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ بدترین آواز گدھے کی ہوتی ہے۔"

آج کی مادہ پرستانہ، سیکولر اور زرد صحافت کے تاریک دور میں خالص قرآنی فکر پر مبنی پرچے کا جاری رہنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام خود پڑھئے، دوسروں کو پیش کیجئے۔